منشی پریم چند

میری لائبریری

بہترین افسانے

ترتیب، انتخاب، تنقید

ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا

میری لائبریری ہی میں

پہلی بار

قیمت آٹھ روپے

12/

برقی کتب کی دنیا میں خوش آمدید

آپ ہمارے کتابی سلسلے کا حصہ بن سکتے ہیں

مزید اس طرح کی شان دار، مفید اور نایاب کتب

کے حصول کے لیے ہمارے واٹس ایپ گروپ کو

جوائن کریں

ایڈمن پینل :

محمد ثاقب ریاض: 03447227224

سدرہ طاہر: 03340120123

حسنین سیالوی: 03056406067

Imagitor

HaSnain Sialvi

پریم چند کے بہترین افسانے

ترتیب، انتخاب، تنقید

ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا

مکتبہ میری لائبریری لاہور

HaSnain Sialvi

ترتیب

تعارف، مصنّف		صفحہ ۵
کچھ اس مجموعے کے بارے میں		۶
دیباچہ		۷
راہ نجات	(پریم چالیسی)	۱۸
قزاقی	〃	۳۳
عیدگاہ	〃	۵۱
مجبوری	(فردوس خیال)	۷۰
دودھ کی قیمت	(دودھ کی قیمت)	۸۱
دو بہنیں	〃	۹۳
لاٹری	(زادِ راہ)	۱۱۱
خانہ داماد	〃	۱۲۸
بڑے بھائی صاحب	〃	۱۴۳
پنچایت	(پریم بتیسی)	۱۵۴
دو بیل	〃	۱۶۹
طلوعِ محبت	(واردات)	۱۸۶
کفن		۲۲۲

مصنف : منشی پریم چند (۱۸۸۰ تا ۱۹۳۶ء)

تاریخ وفات : ۸ اکتوبر ۱۹۳۶ء

پیدائشی نام : دھنپت رائے۔

چچا کا دیا ہوا نام : نواب رائے

جائے پیدائش : موضع لمہی، نزد بنارس۔

پانچ برس کی عمر میں اُردو فارسی پڑھنے کے لئے ایک مولوی صاحب کے پاس بٹھایا گیا۔ والد محکمہ ڈاک میں ملازم تھے، اُن کے تبادلہ ہو جانے پر تیرہ برس کی عمر میں گورکھپور مشن ہائی سکول میں چھٹی جماعت میں داخل ہوئے۔ پندرہ برس کی عمر میں شادی ہوئی۔

ملازمت | ۱۸۹۹ء میں اٹھارہ روپے ماہوار پر سکول ماسٹر ہو گئے۔ ۱۹۱۹ء میں بی اے کا امتحان پاس کیا۔ ۱۹۲۲ء میں حادثۂ جلیانوالہ اور تحریک عدم تعاون سے متاثر ہو کر ملازمت سے استعفیٰ ہونے سے وفات تک مختلف اوقات میں کئی رسائل و جرائد کی ادارت کے فرائض انجام دیئے۔

مرتب : ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا

تعلیمی اسناد (۱) بی۔اے (آنرز)

گورنمنٹ کالج لاہور

(۲) ایم۔اے (اُردو) اوّل بدرجہ اوّل

یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور

(۳) پی ایچ ڈی :

سرٹیفکیٹ اِن ہندی۔

ملازمت : اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ اُردو

یونیورسٹی اورینٹل کالج، لاہور

تصانیف :

(۱) نئے پرانے خیالات (تنقیدی مضامین)

(۲) قدیم اصنافِ شعر

(۳) اُردو میں قطعہ نگاری

(۴) اکبر الہ آبادی

اس کے علاوہ متعدد تنقیدی مضامین جرائد میں چھپ چکے ہیں

HaSnain Sialvi

کچھ اس مجموعے کے بارے میں

پریم چند کے بہترین افسانے کے نام سے یہ مجموعہ ان کے تمام مجموعوں کا عطر ہے۔ اس انتخاب سے پریم چند کے افسانوں کی تمام خصوصیات واضح ہو جائینگی البتہ ان کی فنی کمزوریاں ظاہر نہ ہوں گی جن سے روشناسی کے لئے ان کے مجموعے تمام و کمال پڑھنے ہوں گے۔ اس اعتبار سے یہ افسانے واقعی پریم چند کے بہترین افسانے ہیں مجھے امید ہے کہ وہ لوگ جو پریم چند کے افسانوں کی محض تاریخی اہمیت کے قائل ہیں، اس انتخاب کے مطالعے کے بعد اپنی رائے میں تبدیلی محسوس کریں گے مگر جو لوگ اُن کے فن کی عظمت کے قائل ہیں ان کے لئے یہ انتخاب یقین کو محکم کرنے کی بنیاد دیں مہیا کرے گا۔

پریم چند کی عظمت کا دارومدار محض انہی چند افسانوں پر نہیں، اسی ضخامت اور معیار کا کم از کم ایک اور مجموعہ مرتب ہو سکتا ہے۔

اس مجموعے کی ترتیب کے دوران میرے دوستوں میں سے مسرور کیفی، فقیر احمد، زبیر منگلوری اور اعجاز احمد بیگ نے قابلِ قدر تعاون کیا۔ میری بیوی نے انتخاب کے متعدد مراحل میں معاونت کی۔ جناب چودھری بشیر احمد ڈائرکٹر مکتبہ میری لائبریری کی داد دیتا ہوں، ان کے پیہم اصرار نے آخر اسے مکمل کرا ہی لیا۔ ورنہ شاید مجھ سے اس کی تکمیل کبھی نہ ہو پاتی۔

بہر طور اب یہ مجموعہ نذرِ قارئین ہے۔

خواجہ محمد زکریا
اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اُردو
پنجاب یونیورسٹی، اورینٹل کالج لاہور

لاہور
۶ر نومبر ۱۹۷۳ء

جملہ حقوق اشاعت (دائمی) بحق مکتبہ میری لائبریری محفوظ

ناشر: بشیر احمد چودھری، ڈائرکٹر مکتبہ میری لائبریری لاہور ۲
طابع: آلِ بشیر پرنٹرز، لاہور ۲
بار اوّل: ۱۹۷۵ء

HaSnain Sialvi

دیباچہ

منشی پریم چند اردو کے پہلے افسانہ نگار ہی نہیں اس صنف کی روایت کو اُردو میں اس قدر مستحکم کر دینے والے ہیں کہ ان کے بعد اس کے زوال آمادہ ہونے کا دھڑکا نہیں رہتا۔ وہ بے تکان لکھنے والوں میں تھے۔ ان کے ایک درجن سے زیادہ ضخیم ناول، افسانوں کے چودہ مجموعے، چند ڈرامے اور بعض متفرق تحریریں محض مقدار کے اعتبار سے بھی بے حد تاریخی اہمیت کی حامل ہوتیں، تاہم ان کی مستقل حیثیت بھی متنازعہ فیہ نہیں۔ یہ ایسا کارنامہ ہے جو اردو کے کسی اور قصہ گو کو نصیب نہیں ہو سکا۔ اردو کا کوئی اور ادیب بیک وقت اتنا بڑا افسانہ نویس اور ناول نگار بننے کا شرف حاصل نہیں کر سکا۔

گزشتہ چند برسوں میں پریم چند پر بہت سا تحقیقی اور تنقیدی کام ہوا ہے۔ ہندوستان میں وہ بہت سے نقادوں کے لئے جاذبِ توجہ بنے ہیں۔ خصوصاً مدن گوپال کی نئی انگریزی تصنیف "منشی پریم چند" تحقیق کے اعتبار سے اس موضوع پر لاجواب تصنیف ہے جس

میں ان کے تقریباً تمام افسانوں کے سنین مستند ماخذ کے ذریعے متعین کر دیئے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ ایم۔اے اور پی ایچ ڈی کے کئی تحقیقی مقالے ان کی شخصیت اور فن پر لکھے گئے ہیں۔ اس کے باوجود یہ بھی حقیقت ہے کہ ان کے افسانوں کے متعدد مجموعے پاکستان میں عرصے سے شائع نہیں ہوئے اور اس قدر کمیاب ہو چکے ہیں کہ کتب خانوں میں بھی بمشکل ملتے ہیں۔ اس لئے میں نے مناسب سمجھا کہ اگر ان کے تمام مجموعوں کی نئے سرے سے اشاعت ممکن نہیں تو کم از کم ان کا ایک اچھا انتخاب کر کے شائع کرانا ضروری ہے تاکہ لوگوں کو اندازہ ہو جائے کہ اتنی مدت گزر جانے کے باوجود پریم چند کے ہاں متعدد ایسے افسانے موجود ہیں جو آج بھی دلچسپی سے پڑھے جا سکتے ہیں اور بعض افسانے تو فن کے اعتبار سے اس قدر مکمل ہیں کہ ان پر کوئی اضافہ ہوتا نظر نہیں آتا۔ اسی ضرورت کے پیشِ نظر یہ انتخاب نذرِ قارئین ہے۔ پریم چند نے "میرے بہترین افسانے" کے نام سے خود بھی اپنے افسانوں کا انتخاب کیا تھا۔ مگر ایک تو یہ ضروری نہیں کہ مصنف اپنی تحریروں کا بہتر منصف بھی ہو، دوسرے ہر عہد کے کچھ تقاضے ہوتے ہیں جن کی وجہ سے عہد بہ عہد نئے انتخاب کی ضرورت پیدا ہوتی ہے۔ یہی سبب ہے کہ اس مجموعے میں "میرے بہترین افسانے" میں سے بہت کم افسانے شامل کئے گئے ہیں۔ اس کے برعکس اکثریت اُن افسانوں کی ہے جو ٹکنیک میں موجودہ افسانے سے زیادہ قریب ہیں۔

پریم چند کے افسانوں کے جو سولہ مجموعے چھپے ہیں ان کے نام یہ ہیں:-

(۱) سوزِ وطن یا سیرِ درویش (۲) پریم پچیسی دو حصے (۳) پریم بتیسی دو حصے۔ (۴) پریم چالیسی دو حصے (۵) زادِ راہ (۶) دودھ کی قیمت (۷) دیہات کے

افسانے (انتخاب)، (۸) فردوس خیال (۹) واردات (۱۰) آخری تحفہ (۱۱) خواب وخیال (۱۲) خاک پروانہ (۱۳) میرے بہترین افسانے (انتخاب) (۱۴) بازیافت (انتخاب)، (۱۵) خونِ سفید (انتخاب) ـــــ علاوہ ازیں ایک اور مجموعہ "مسافر" بھی پریم چند کے نام سے چھپا ہے لیکن یہ منشی پریم چند کی تصنیف نہیں، ان کے کسی اور ہم نام کی کاوش ہے۔ نام میں ابہام ان کی شہرت سے فائدہ اٹھانے کے لئے رکھا گیا ہے۔ ان میں پریم مجموعوں کا سلسلہ بظاہر تین مگر درحقیقت چھ کتابوں پر مشتمل ہے۔ زادِ راہ، دودھ کی قیمت، دیہات کے افسانے، فردوسِ خیال، واردات، آخری تحفہ، خواب وخیال اور خاکِ پروانہ آٹھ مستقل مجموعے ہیں۔ بقیہ مجموعوں کے افسانے منتخب کئے گئے ہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ ان کے مستقل افسانوی مجموعے چودہ ہیں۔ ان میں افسانوں کی کل تعداد پونے تین سو کے لگ بھگ ہے۔ اردو کے بہت کم افسانہ نگار معیار و مقدار میں ان کی برابری کر سکتے ہیں۔

پریم چند کے افسانوں کے تمام مجموعے یکساں معیار کے حامل نہیں ہیں۔ پہلے مجموعے یعنی سوزِ وطن کے معیار کا مقابلہ بعد کے مجموعوں سے کیا جائے تو زمین آسمان کا فرق نظر آتا ہے۔ سوزِ وطن کے افسانوں کو آج کے معیار کے مطابق افسانے کی صنف میں شامل ہی نہیں کیا جا سکتا۔ ان پر داستانوں خصوصاً طلسم ہوش ربا وغیرہ کے گہرے اثرات دکھائی دیتے ہیں۔ مثلاً کسی شخص کا چند مشکل شرائط پوری کر کے گوہرِ مقصود کا حصول وغیرہ۔ تحقیق سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ پریم چند کے لاشعور میں داستانوں کے گہرے اثرات موجود تھے۔ سوزِ وطن سے پریم پچیسی تک کا سفر داستان سے افسانے تک کا سفر ہے۔ پریم پچیسی کے افسانے فن میں بہت

خام ہیں مگر ان میں صنفِ افسانہ کی بنیادی شرائط پائی جاتی ہیں۔ اگرچہ زندگی کو دیکھنے کا انداز بڑا مثالی اور رومانی سا ہے۔ واقعات کی رفتار فطری نہیں حادثاتی ہے۔ پریم بتیسی کے افسانے بھی مثالی اور رومانی اور ناہموار ہیں مگر "پچیسی" سے بہتر ہیں یا یہ کہنا چاہیئے کہ قدرے کم ناہموار ہیں۔ لیکن جب ان سے گزر کر ہم "پریم چالیسی" کے افسانوں پر پہنچتے ہیں تو نمایاں فرق محسوس ہوتا ہے۔ اتنی ریاضت کے بعد افسانے کے فن پر پریم چند کو عبور حاصل ہوتا ہوا نظر آتا ہے۔ وہ رومانی انداز کی تخیلاتی دنیا سے نکل کر زندگی کی تلخ حقیقتوں سے آنکھیں چار کرنے لگے ہیں۔ ان کے مشاہدے ہیں وسعت اور نگاہ میں عمق پیدا ہونے لگا ہے۔ انھیں اس بات کی آگاہی ہوگئی ہے کہ دنیا "شاعرانہ انصاف" کی بھری پُری اقلیم نہیں ہے بلکہ اس کے برعکس شاید بے انصافیوں کی سرزمین ہے۔ زمانہ کسی کو صلاحیت سے بہت زیادہ اور کسی کو بہت کم دیتا ہے۔ کسی کو ضرورت سے بہت زیادہ میسّر آتا ہے اور کسی کو خونِ پسینہ ایک کرکے بہت کم حاصل ہوتا ہے۔ انھیں معلوم ہونے لگتا ہے کہ دنیا کی دوستیاں اخلاص اور محبتیں عارضی ہوتی ہیں۔ حسد اور خواہش کے ہاتھوں میں انسان کھلونا ہے قصہ کوتاہ یہ کہ ہمارے مشاہدے سے گزرنے والی ٹھوس زندگی کا شعور ان میں پیدا ہوگیا ہے اور وہ حقیقت پسندی کے نقطۂ نظر کو اپنانے کی بھرپور کوشش کرنے لگے ہیں۔ اگرچہ کہیں کہیں مثالیت پسندی کو بھی رشک کی نظروں سے دیکھ لیتے ہیں۔ پریم چالیسی کے بعد ان کے جتنے مجموعے چھپے ہیں ان میں یہی اندازِ نظر جھلکتا نظر آتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے اس سے پہلے کے افسانوں کو اس انتخاب میں یکسر نظر انداز کردیا ہے۔ اگرچہ پریم چند کا ذہنی ارتقا دیکھنے کے لئے ابتدائی افسانوں کا مطالعہ بھی ضروری

ہے لیکن اس قبیل کے افسانوں سے بھی افسانے منتخب کئے جائیں تو ایسے انتخاب کو "بہترین افسانے" قرار نہیں دیا جا سکتا۔

اس مجموعے میں جو چودہ افسانے منتخب کئے گئے ہیں وہ تکنیک کے اعتبار سے متنوع ہیں۔ ان میں راہ نجات اور کفن جیسے حقیقت پسندانہ افسانے بھی ہیں بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ زندگی کی تلخ حقیقتوں کے ترجمان ہیں۔ پریم چند کو ترقی پسند قرار دیا جاتا ہے مگر ترقی پسندوں کے ہاں انسان فطرتاً نیک ہوتا ہے البتہ ماحول اور حالات اسے خراب کر دیتے ہیں مگر ان افسانوں میں اور خاص طور پر راہِ نجات میں انسانوں کی فطری کمزوریوں سے المیہ وجود میں آتا ہے اور وہ بعض ماہرینِ نفسیات کی طرح انسان کے باطن میں چھپی ہوئی خرابیوں کو المیے کا ذمہ دار ٹھہراتے ہیں۔

دودھ کی قیمت اور مجبوری ہندو معاشرے کے عقائد و رسومات کی بنیاد پر تخلیق ہونے والے افسانے ہیں۔ جس معاشرے میں بیوہ کی شادی کو بُرا سمجھا جاتا ہو اور جہاں نچلے طبقے کے لوگوں کو اچھوت قرار دے دیا جائے وہاں ایسے ہی واقعات ہوا کرتے ہیں۔ ان دونوں افسانوں کو اس لحاظ سے اصلاحی کاوشیں قرار دیا جا سکتا ہے کہ افسانہ نگار یہاں بیوگان کی شادی اور چھوت چھات کے خاتمے کی طرف معاشرے کے پڑھے لکھے لوگوں کو متوجہ کر رہا ہے۔ ان دونوں افسانوں کے اسلوب میں شدید طنز اور کاٹ ہے۔

لاٹری، بڑے بھائی صاحب اور شکوہ شکایت بھی طنزیہ افسانے ہیں مگر ان میں مزاح کی خوشگوار آمیزش ہے۔ یہاں پریم چند نے انسانی کمزوریوں پر نشتر نہیں

لگائے بلکہ ہنسی ٹھٹھے کے ذریعے متوجہ کیا ہے اور جب ایک دفعہ قاری متوجہ ہو جاتا ہے تو اسے سوچنے پر بھی مجبور ہونا پڑتا ہے۔ وہ اسی نتیجے پر پہنچنے میں زیادہ وقت صرف نہیں کرتا کہ انسان بنیادی طور پر خطا و نسیان کا مریض ہے۔ بظاہر کچھ بنتا ہے اور بباطن کچھ اور ہی ہوتا ہے۔ دیگراں را نصیحت، خود را فضیحت کا مجسمہ ہے۔ اپنی کمزوریوں سے آنکھ بند کر کے دوسروں کی کمزوریاں تلاش کرنے میں سرگرداں رہتا ہے بیوی میاں کی عادتوں پر ناک بھوں چڑھاتی ہے اگرچہ دل میں اسے پسند کرتی ہے۔ بڑا بھائی جھوٹے پر رعب ڈالتا ہے خواہ اس کی کوئی معقول بنیاد نہ ہو، اور اس کے برعکس بھی ہو سکتا ہے۔ دوست دوست کو دھوکا دے جاتا ہے اگر اس کے مفاد کا تقاضا ہو۔ غرض انسانی دوستیاں، تعلقات، عزیزداریاں کتنے ہی نازک موڑوں پر آکر دم توڑ جاتی ہیں۔ دنیا میں عموماً یہی کچھ ہوتا ہے۔ اگر اس کے برعکس ہو جائے تو تعجب خیز معلوم ہوتا ہے۔

قزاقی ایک رومانی افسانہ ہے مگر اتنا خوبصورت کہ اس پر سو حقیقتیں قربان۔ افسانہ پڑھنے کے بعد اور کچھ یاد رہے یا نہ رہے۔ مضبوط جسم کا دلکش قزاقی کندھے پر بلم رکھے، گھونگھرو بجاتا، دور سے دوڑتا ہوا آتا دکھائی دیتا ہے۔ قزاقی اردو افسانے کا ایک ناقابلِ فراموش اور زندہ جاوید کردار ہے جس کی طرف تعجب ہے کہ اب تک نقادوں نے توجہ نہیں دی۔ بچپن کی یادوں کی مہک میں بسا ہوا یہ افسانہ ہمیں اپنے بچپن کے عہد میں واپس لے جاتا ہے جب کائنات ہمارے لئے ایک تازہ تجربے کی حیثیت رکھتی تھی اور ہر چیز سراپا مسرت و حیرت تھی۔

لاٹری، راہ نجات، مجبوری، دودھ کی قیمت وغیرہ زندگی کے تاریک رُخ کی

HaSnain Sialvi

عکاسی کرنے والے افسانے ہیں۔ ایسے افسانوں میں کفن کو خصوصی اہمیت دی جاتی رہی ہے۔ یہ افسانہ بے رحم حقیقت نگاری کی عمدہ مثال ہے۔ ناداری اور غربت انسانوں کو کس قدر بے حس اور خود غرض بنا دیتی ہیں! یہی اس افسانے کا موضوع ہے۔ گھیسو اور مادھو کس قدر بے رحم معلوم ہوتے ہیں مگر جس تناظر میں انھیں پیش کیا گیا ہے اس میں وہ حق بجانب نظر آنے لگتے ہیں۔ ہمارے رسم و رواج پہ کیسی شدید طنز ہے جو دونوں کے مکالمات سے اُبھرتی ہے:

گھیسو بولا، لکڑی تو اُسے جلانے بھر کو مل گئی ہے۔

مادھو بولا، ہاں لکڑی تو بہت ہے اب کپھن چاہیے۔

'کیا بُرا رواج ہے کہ جسے جیتے جی تن ڈھانکنے کو چیتھڑا بھی نہ ملے اُسے مرنے کے بعد نیا کپھن چاہیے۔'

'کپھن لاش کے ساتھ جل ہی تو جاتا ہے۔'

'اور کیا رکھا رہتا ہے۔ یہی پانچ روپے ملتے تو دوا دارو کرتے،'

مگر پریم چند زندگی کے تاریک رُخ کو ہی پیش نہیں کرتے۔ ان کے ہاں انسان محض حرص، لالچ اور خواہش ہی کا بندہ نہیں خیر کے جذبے سے بھی بہرہ ور ہے۔ یہ درست ہے کہ زندگی میں قدم قدم پہ ہمارا واسطہ شر کی رکاوٹوں سے پڑتا ہے لیکن دنیا میں اچھے افراد بھی موجود ہیں — اگر ان کا وجود نہ ہوتا تو دنیا نہایت خوفناک جگہ ہوتی جہاں پیار، فرض شناسی، دیانت داری اور انصاف کا وجود بھی نہ ہوتا۔ دنیا اگر تمام تر برائیوں کے باوصف دلچسپ جگہ ہے تو اس وجہ سے کہ یہ مکمل طور پہ تاریک دلوں کا ملجا نہیں ہے بلکہ ہر انسان کے اندر نیکی کی رمق ضرور موجود ہوتی ہے، بس اُسے

ذرا مناسب طریقے سے کرید کر شعلۂ جوالہ بنانے کی ضرورت ہے۔ اس لئے پریم چند زندگی کا روشن پہلو بھی بلا تامل پیش کرتے ہیں۔ 'طلوعِ محبت'، 'پنچایت'، 'عیدگاہ' (اور قزاقی جس کا ذکر آچکا) زندگی کے روشن پہلو کو ہمارے سامنے لاتے ہیں۔ گویا پریم چند کے افسانوں میں خیر و شر کی دھوپ چھاؤں موجود ہے — یہی حقیقت نگاری ہے، ورنہ محض تاریک پہلوؤں کی تصویر کشی کو حقیقت نگاری کا نام دینا صحیح نہ ہوگا۔

اب سرسری طور پر ان افسانوں کے اندازِ پیش کش یا طرزِ اظہار کی طرف توجہ فرمائیے۔ راہِ نجات، عیدگاہ، دو بہنیں، پنچایت، طلوعِ محبت، شکوہ شکایت، کفن وغیرہ سیدھی سادی بیانیہ تکنیک میں لکھے گئے ہیں۔ ممتاز شیریں "معیار" میں لکھتی ہیں:

> "اردو کے اچھے افسانوں میں سے یونہی چند چن لیجئے، آنندی، حرامجادی، ہماری گلی، بالکونی، شکوہ شکایت، یہ کس تکنیک میں لکھے گئے ہیں؟ بیانیہ۔ ٹھیک! ان میں مکالمے سے زیادہ کام نہیں لیا گیا۔ ان کے کردار افسانے کے دوران میں زیادہ کام بھی نہیں کرتے۔ یعنی اس طرح نہیں کہ ان کے عمل اور گفتگو ہی سے ان کے کیریکٹر کا خاکہ کھنچ جائے بلکہ ان میں داستان بیان کی گئی ہے خود مصنف کی زبانی یا مصنف کسی کردار کو بیان کرنے کے لئے آگے کر دیتا ہے۔ ان سب افسانوں کے متعلق یہ کہنا کہ یہ بیانیہ میں لکھے گئے ہیں، تکنیک کی صرف موٹی تقسیم ہوگی کیونکہ ان میں ہر افسانہ اپنی ایک علیحدہ تکنیک میں ڈھلا ہوا ہے۔ اِس لئے تکنیک کے تنوع کی مثال پیش کرتے ہوئے ان افسانوں کے نام گنائے جا سکتے ہیں۔"

بعینہٖ پریم چند کے افسانے بھی 'موٹی' تقسیم کے مطابق بیانیہ ہیں لیکن ان میں

سے ہر ایک کی الگ تکنیک بھی ہے۔ مثال کے طور پر 'خانہ داماد' بیانیہ انداز میں شروع ہوتا ہے۔ لیکن وسط میں فلیش بیک کی تکنیک آموجود ہوتی ہے۔ ذرا بعد دوبارہ افسانے کا سلسلہ بیانیے سے جُڑ جاتا ہے۔ اختتام سے ذرا پہلے ایک مختصر سے وقفے کے لئے فلیش بیک کا دوبارہ استعمال تاثر کی شدت میں بے پناہ اضافہ کر دیتا ہے۔

'بڑے بھائی صاحب' اور 'شکوہ شکایت' واحد متکلم میں ہیں۔ یہاں واقعات کا بیان افسانہ نگار کی زبان سے نہیں ہے بلکہ چھوٹے بھائی اور بیوی کی زبانی ہے۔ واحد متکلم کے بیانیے واقعات کی شدید جکڑ بندی سے آزاد ہوتے ہیں۔ ان میں زندگی کا سا آزاد تسلسل موجود ہوتا ہے اس لئے زیادہ حقیقی اور واقعی معلوم ہوتے ہیں۔

پریم چند کے افسانوں میں جزئیات کا استعمال نہایت متوازن اور جچا تلا ہے۔ وہ کبھی تفصیلات کے انبار لگانا پسند نہیں کرتے۔ وہ محض اسی قدر جزئیات کے بیان کے شائق ہیں جو واقعات کا اثر بڑھانے میں ممد ہوں۔ ان کے اچھے افسانوں کو پڑھنے سے کبھی یہ احساس پیدا نہیں ہوتا کہ ان میں حشو و زوائد کا استعمال ہوا ہے۔

موجودہ دور کے افسانہ نگاروں اور پریم چند میں نمایاں فرق یہ ہے کہ پریم چند کے ہاں افسانہ ہر حال میں افسانہ رہتا ہے۔ اس کی افسانویت یا کہانی بہر صورت سب افسانوی عناصر سے زیادہ اہم جزو کی حیثیت رکھتی ہے۔ ان کے ہاں واقعات کے بغیر افسانہ ایک قدم نہیں چلتا۔ وہ افسانے کو کبھی خاکہ نہیں بننے دیتے۔ ان کے

ہاں واقعات کی کمی کا ازالہ طویل نفسیاتی تجزیوں سے نہیں کیا جاتا۔ ان کے ہاں پلاٹ اتنے بھرپور ہوتے ہیں کہ وہ قاری کو ادھر اُدھر بھٹکنے ہی نہیں دیتے۔ ان کے افسانوں میں آج بھی جدید افسانہ نگاروں کے لئے سبق پنہاں ہے کہ افسانے کی ریڑھ کی ہڈی اس کا پلاٹ ہے۔ واقعات کے سلسلے کے بغیر کامیاب افسانہ لکھنا بہت مشکل ہے، لیکن اگر موضوع کا اظہار واقعات کے تسلسل میں کیا جائے تو افسانے کی کامیابی میں کوئی شبہ نہیں رہ جاتا۔

HaSnain Sialvi

راہِ نجات

(۱)

سپاہی کو اپنی سرخ پگڑی پر حسینہ کو اپنے زیور پر اور طبیب کو اپنے پاس بیٹھے ہوئے مریضوں پر جو غرور ہوتا ہے وہی کسان کو اپنے کھیتوں کو لہراتے ہوئے دیکھ کر ہوتا ہے۔ جھینگرا اپنے ایکھ کے کھیتوں کو دیکھتا تو اُس پر نشہ طاری ہو جاتا۔ تین بیگھے ایکھ تھی، اُس کے چھ سو تو آپ ہی مل جائیں گے، اور جو کہیں بھگوان نے ڈانڈی تیز کر دی (مراد نرخ سے) تو پھر کیا پوچھنا۔ دونوں بیل بوڑھے ہو گئے۔ اب کی نئی گوئیں بٹیسر کے میلے سے لے آوے گا۔ کہیں دو بیگھے کھیت اور مل گئے تو لکھا لے گا۔ روپوں کی کیا فکر ہے، بنئے ابھی سے خوشامد کرنے لگے تھے۔ ایسا کوئی نہ تھا جس سے اس نے گاؤں میں لڑائی نہ کی ہو۔ وہ اپنے آگے کسی کو کچھ سمجھتا ہی نہ تھا۔

ایک روز شام کے وقت وہ اپنے بیٹے کو گود میں لئے مٹر کی پھلیاں توڑ رہا تھا،

اتنے میں اُس کو بھیڑوں کا ایک جھنڈ اپنی طرف آتا دکھائی دیا۔ وہ اپنے دل میں کہنے لگا، ادھر سے بھیڑوں کے نکلنے کا راستہ نہ تھا۔ کیا کھیتوں کی مینڈ پر سے بھیڑوں کا جھنڈ نہیں جا سکتا تھا؟ بھیڑوں کو ادھر سے لانے کی کیا ضرورت؟ یہ کھیت کو کچلیں گی، چریں گی، اِس کا دام کون دے گا۔ معلوم ہوتا ہے بدھو گڈریا ہے۔ بچہ کو گھمنڈ ہو گیا ہے جبھی تو کھیتوں کے بیچ سے بھیڑیں لئے چلا آتا ہے، ذرا اس کی ڈھٹائی تو دیکھو، دیکھ رہا ہے کہ میں کھڑا ہوں اور پھر بھی بھیڑوں کو لوٹاتا نہیں۔ کون میرے ساتھ کبھی سلوک کیا ہے کہ اس کی مروّت کروں۔ ابھی ایک بھیڑا مول مانگوں تو پانچ روپے ہی سُنا دے گا۔ ساری دنیا میں چار روپے کے کمبل بکتے ہیں، یہ پانچ روپے سے کم بات نہیں کرتا۔

اتنے میں بھیڑیں کھیت کے پاس آگئیں۔ جھینگر نے للکار کر کہا۔ ارے یہ بھیڑیں کہاں لے آتے ہو؟ کچھ سوجھتا ہے کہ نہیں؟

بدھو انکسار سے بولا۔ مہتو ڈانڈ پر سے نکل جائیں گی، گھوم کر جاؤں گا تو کوس بھر کا چکر پڑے گا۔

جھینگر۔ تو تمہارا چکر بچانے کے لئے میں اپنا کھیت کیوں کچلاؤں۔ ڈانڈ ہی پر سے لے جانا ہے تو اور کھیتوں کے ڈانڈ سے کیوں نہیں لے گئے؟ کیا مجھے کوئی چمار بھنگی سمجھ لیا ہے یا روپیہ کا گھمنڈ ہو گیا ہے؟ لوٹاؤ ان کو۔

بدّھو۔ مہتو آج نکل جانے دو۔ پھر کبھی ادھر سے آؤں تو جو ڈنڈ (سزا) چاہے دینا۔

جھینگر۔ کہہ دیا کہ لوٹاؤ انھیں۔ اگر ایک بھیڑ بھی مینڈھ پر چڑھ آئی تو تمہاری کسل نہیں۔

HaSnain Sialvi

بدھو ۔ مہتو اگر تمہاری ایک بیل بھی کسی بھیڑ کے نیچے آجائے تو مجھے بٹھا کر سو گالیاں دینا۔

بدھو باتیں تو بڑی لجاجت سے کر رہا تھا مگر لوٹنے میں اپنی کسرِ شان سمجھتا تھا۔ اُس نے دل میں سوچا کہ اسی طرح ذرا ذرا سی دھمکیوں پر بھیڑوں کو لوٹانے لگا تو پھر میں بھیڑیں چرا چکا۔ آج لوٹ جاؤں گا تو کل کو کہیں نکلنے کا راستہ ہی نہ ملے گا، سبھی رعب جمانے لگیں گے۔

بدھو بھی گھر کا مضبوط آدمی تھا۔ بارہ کوڑی بھیڑیں تھیں۔ اُنھیں کھیتوں میں بٹھانے کے لئے فی شب آٹھ آنے کوڑی مزدوری ملتی تھی۔ اس کے علاوہ دودھ بھی فروخت کرتا تھا۔ اُون کے کمبل بناتا تھا۔ سوچنے لگا: "اتنے گرم ہو رہے ہیں، میرا کر ہی کیا لیں گے؟ کچھ ان کا دبیل تو ہوں نہیں۔" بھیڑوں نے جو ہری ہری پتیاں دیکھیں تو بے کل ہو گئیں۔ کھیت میں گھس پڑیں۔ بدھو انہیں ڈنڈوں سے مار مار کر کھیت کے کنارے سے ہٹاتا تھا اور وہ ادھر اُدھر سے نکل کر کھیت میں جا گھستی تھیں۔ جھینگر نے گرم ہو کر کہا۔ تم مجھے ہینکڑی جتانے چلے ہو تو تمہاری ہینکڑی بھلا دوں گا۔

بدھو۔ تمہیں دیکھ کر سبھی کتی ہیں، تم ہٹ جاؤ تو میں سب کو نکال لے جاؤں۔

جھینگر نے لڑکے کو گود سے اُتار دیا۔ اور اپنا ڈنڈا سنبھال کر بھیڑوں کے سر پڑ گیا۔ بدھو بھی اتنی بے دردی سے اپنے گدھوں کو نہ مارتا ہوگا۔ کسی بھیڑ کی ٹانگ ٹوٹی، کسی کی کمر ٹوٹی۔ سب نے زور سے ممیانا شروع کیا۔ بدھو خاموش کھڑا ہوا اپنی فوج کی تباہی، اپنی آنکھوں سے دیکھتا رہا۔ وہ نہ بھیڑوں کو ہانکتا تھا اور جھینگر سے کچھ کہتا تھا، بس کھڑا ہوا تماشا دیکھتا رہا۔ دو منٹ میں جھینگر نے اس فوج کو حیرانی

HaSnain Sialvi

طاقت سے مار بھگایا۔ بھیڑوں کی فوج کو تباہ کر کے فاتحانہ غرور سے بولا۔ اب سیدھے چلے جاؤ پھر ادھر سے آنے کا نام نہ لینا۔

بدھو نے چوٹ کھائی ہوئی بھیڑوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ جھینگر تم نے یہ اچھا کام نہیں کیا۔ پچھتاؤ گے۔

(۲)

کیلے کا کاٹنا بھی اتنا آسان نہیں، جتنا کسان سے بدلا لینا۔ اُس کی ساری کمائی کھیتوں میں رہتی ہے یا کھلیانوں میں۔ کتنی ارضی و سماوی آفات کے بعد کہیں اناج گھر میں آتا ہے اور جو کہیں آفات کے ساتھ عداوت نے میل کر لیا تو بیچارہ کسان کہیں کا نہیں رہتا۔ جھینگر نے گھر آکر اور لوگوں سے اس لڑائی کا حال کہا تو لوگ سمجھانے لگے۔ "جھینگر! تم نے بڑا بُرا کیا۔ جان کر انجان بنتے ہو۔ بدھو کو جانتے نہیں کہ کتنا جھگڑالو آدمی ہے۔ ابھی کچھ نہیں بگڑا۔ جا کر اُسے منا لو نہیں تو تمہارے ساتھ گاؤں پر آفت آجائے گی" جھینگر کے سمجھ میں بات آئی۔ پچھتانے لگا کہ میں نے کہاں سے کہاں اُسے روکا۔ اگر بھیڑیں تھوڑا بہت چر ہی جاتیں تو کون میں اُجڑا جاتا تھا۔ اصل میں ہم کسانوں کا بھلا دب کر رہنے ہی میں ہے۔ بھگوان کو بھی ہمارا سر اُٹھا کر چلنا اچھا نہیں لگتا" جی تو بدھو کے پاس جانے کو نہ چاہتا تھا مگر دوسروں کے اصرار سے مجبور ہو کر چلا۔ اگھن کا مہینہ تھا۔ کہرا پڑ رہا تھا۔ چاروں طرف تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ گاؤں سے باہر نکلا ہی تھا کہ یکایک اپنے اکھ کے کھیت کی طرف آگ کے شعلے دیکھ کر چونک پڑا۔ دل دھڑکنے لگا۔ کھیت میں آگ لگی ہوئی تھی۔ بے تحاشا دوڑا۔ مناتا جاتا تھا کہ میرے کھیت میں نہ ہو۔ مگر جیوں جیوں

قریب پہنچتا تھا یہ پر اُمید وہم دور ہوتا جاتا تھا۔ وہ غضب ہو ہی گیا جسے روکنے کے لئے وہ گھر سے چلا تھا۔ ہتیارے نے آگ لگا دی اور میرے پیچھے سارے گاؤں کو چوپٹ کر دیا۔ اُسے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ کھیت آج بہت قریب آگیا ہے گویا درمیان کی پرتی کھیتوں کا وجود ہی نہیں رہا۔ آخر جب وہ کھیت پر پہنچا تو آگ خوب بھڑک چکی تھی۔ جھینگر نے ہائے ہائے کرنا شروع کیا۔ گاؤں کے لوگ دوڑ پڑے اور کھیتوں سے ارہر کے پودے اکھاڑ اُکھاڑ کر آگ کو پیٹنے لگے۔ انسان و آتش کی باہمی جنگ کا منظر پیش ہوگیا۔ ایک پہر تک کہرام برپا رہا۔ کبھی ایک فریق غالب آتا کبھی دوسرا۔ آتشی جانباز مرمر کر جی اُٹھتے تھے اور دگنی طاقت سے لڑائی میں مستعد ہو کر ہتھیار چلانے لگتے تھے۔ انسانی فوج میں جس سپاہی کی مستعدی سب سے زیادہ روشن تھی وہ بدھو تھا۔ بدھو کمر تک دھوتی چڑھائے اور جان کو ہتھیلی پر رکھے آگ کے شعلوں میں کود پڑتا تھا اور دشمنوں کو شکست دیتے ہوئے بال بال بچ کر نکل آتا تھا۔ بالآخر انسانی فوج فتحیاب ہوئی مگر ایسی فتح جس پر شکست بھی خندہ زن تھی۔ گاؤں بھر کی ایکھ جل کر راکھ ہوگئی اور ایکھ کے ساتھ ساری تمنائیں بھی جل بھن کر راکھ ہوگئیں۔

آگ کس نے لگائی، یہ کھلا ہوا راز تھا، مگر کسی کو کہنے کی ہمت نہ تھی۔ کوئی ثبوت نہیں اور بلا ثبوت کے بحث کی وقعت ہی کیا؟ جھینگر کو گھر سے نکلنا محال ہوگیا۔ جدھر جاتا طعن و تشنیع کی بوچھار ہوتی۔ لوگ علانیہ کہتے کہ یہ آگ تم نے لگوائی۔ تم ہی نے ہمارا ستیاناس کیا۔ تمہیں مارے گھمنڈ کے دھرتی پر پاؤں نہ رکھتے تھے۔ آپ کے آپ گئے اور اپنے ساتھ گاؤں بھر کو بھی لے ڈوبے۔ بدھو کو نہ چھیڑتے تو آج کیوں یہ دن

دیکھنا پڑتا؛ جھینگر کو اپنی بربادی کا اتنا رنج نہ تھا جتنا ان جلی کٹی باتوں کا۔ تمام دن گھر میں بیٹھا رہتا۔ پوس کا مہینہ آیا جہاں ساری رات کولھو چلا کرتے تھے وہاں سناٹا تھا۔ جاڑوں کے سبب گو شام ہی سے کواڑ بند کر کے پڑ رہتے اور جھینگر کو کوستے تھے۔ ماگھ اور بھی تکلیف دہ تھا۔ ایکھ صرف دولت دینے والی نہیں بلکہ کسانوں کے لئے زندگی بخش بھی ہے۔ اُسی کے سہارے کسانوں کا جاڑا پار ہوتا ہے۔ گرم رس پیتے ہیں، ایکھ کی پتیاں تاپتے ہیں اور اس کے اگوڑے جانوروں کو کھلاتے ہیں۔ گاؤں کے سارے کتے جو رات کو بھٹیوں کی راکھ میں سویا کرتے تھے سردی سے مر گئے۔ کتنے ہی جانور چارے کی قلت سے ختم ہو گئے۔ سردی کی زیادتی ہوئی اور کل گاؤں کھانسی بخار میں مبتلا ہو گیا۔ اور یہ ساری مصیبت جھینگر کی کرنی تھی ابھاگے، ہتیارے جھینگر کی۔ جھینگر نے سوچتے سوچتے قصد کر لیا کہ بدھو کی حالت بھی اپنی جیسی ہی بناؤں گا۔ اُس کے کارن میرا ستیاناس ہو گیا اور وہ چین کی بانسری بجا رہا ہے۔ میں بھی اُس کا ستیاناس کر دوں گا۔

جس روز اس مہلک عناد کی ابتدا ہوئی اسی روز سے بدھو نے اُدھر آنا ترک کر دیا تھا۔ جھینگر نے اس سے ربط ضبط بڑھانا شروع کیا۔ وہ بدھو کو دکھلانا چاہتا تھا کہ تم پر مجھے ذرا بھی شبہ نہیں ہے۔ ایک روز کمبل لینے کے بہانے گیا۔ پھر دودھ لینے کے بہانے جانے لگا۔ بدھو اس کی خوب آؤ بھگت کرتا۔ چلم تو آدمی دشمن کو بھی پلا دیتا ہے، وہ اسے بلا دودھ اور شربت پلائے نہ جانے دیتا۔ جھینگر آج کل ایک سن لپیٹنے والی مشین میں مزدوری کرنے جایا کرتا تھا۔ اکثر کئی کئی روز کی اُجرت یکجائی ملتی تھی۔ بدھو ہی کی مدد سے جھینگر کا روزانہ خرچ چلتا تھا۔ پس جھینگر نے خوب میل جول

پیدا کر لیا۔ ایک روز بدھو نے پوچھا۔ کیوں جھینگر، اگر تم اپنی اکھ جلانے والے کو پا جاؤ تو کیا کرو؟ سچ کہنا۔

جھینگر نے متانت سے کہا۔ میں اُس سے کہوں کہ بھیّا، تم نے جو کچھ کیا بہت اچھا کیا۔ میرا گھمنڈ توڑ دیا۔ مجھے آدمی بنا دیا۔

بدھو۔ میں جو تمہاری جگہ ہوتا تو اُس کا گھر جلائے بنا (بغیر) نہ مانتا۔

جھینگر۔ چار دن کی جندگانی میں بیر بڑھانے سے کون پھائدہ؟ میں تو برباد ہی ہوا، اب اُسے برباد کر کے کیا پاؤں گا؟

بدھو۔ بس یہی تو آدمی کا دھرم ہے۔ مگر بھائی کرودھ (غصہ) کے بس میں ہو کر بدھی (عقل) اُلٹی ہو جاتی ہے۔

(۴)

پھاگن کا مہینہ تھا۔ کسان اکھ بونے کے لئے کھیتوں کو تیار کر رہے تھے، بدھو کا بازار گرم تھا۔ بھیڑوں کی لوٹ مچی ہوئی تھی۔ دو چار آدمی روزانہ دروازے پر کھڑے خوشامد کیا کرتے۔ بدھو کسی سے سیدھے مُنہ بات نہ کرتا۔ بھیڑ بٹھانے کی اُجرت دُگنی کر دی تھی۔ اگر کوئی اعتراض کرتا تو بے لاگ کہتا۔ "بھیّا، بھیڑیں تمہارے گلے تو نہیں لگاتا ہوں۔ جی نہ چاہے تو نہ بٹھلاؤ۔ لیکن میں نے جو کہہ دیا ہے اُس سے ایک کوڑی بھی کم نہیں ہو سکتی۔" غرض تھی۔ لوگ اس بے مروّتی پر بھی اُسے گھیرے ہی رہتے تھے، جیسے پنڈے کسی جاتری کے پیچھے پڑے ہوں۔

لکھشمی کا جسم تو بہت بڑا نہیں اور وہ بھی وقت کے مطابق چھوٹا بڑا ہوتا رہتا ہے۔ حتیٰ کہ کبھی وہ اپنے قد و قامت کو سمیٹ کر چند کاغذی الفاظ ہی

میں چھپالیتی ہے۔ کبھی کبھی تو انسان کی زبان پر جا بیٹھتی ہے، جسم غائب ہو جاتا ہے مگر ان کے رہنے کے لئے وسیع جگہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ زمین اور گھر بڑھنے لگا۔ چھوٹے چھوٹے مکان میں ان سے نہیں رہا جاتا۔ بدھو کا گھر بھی بڑھنے لگا۔ دروازے پر برآمدے کی تعمیر ہوئی۔ دو کی جگہ چھ کوٹھریاں بنوائی گئیں۔ یوں کہئے کہ مکان از سرِ نو بننے لگا۔ کسی کسان سے لکڑی مانگی۔ کسی سے کھپریل کا پرایہ لگانے کے لئے روپے۔ کسی سے بانس اور کسی سے سرکنڈے۔ دیوار بنانے کی اُجرت دینی پڑی وہ بھی نقد نہیں، بھیڑ کے بچوں کی شکل میں۔ لکشمی کا یہ اقبال ہے، سارا کام بیگار میں ہو گیا۔ مفت میں اچھا خاصا مکان تیار ہو گیا۔ داخلے کے جشن کی تیاریاں ہونے لگیں۔

ادھر جھینگر دن بھر مزدوری کرتا تب کہیں آدھا پیٹ اناج ملتا۔ بدھو کے گھر میں کنچن برس رہا تھا۔ جھینگر جلتا تھا تو کیا برا کرتا تھا؟ یہ اَنیائے کس سے سہا جائے گا۔

ایک روز وہ ٹہلتا ہوا چماروں کے ٹولے کی طرف چلا گیا۔ ہری ہر نے آکر رام رام کی اور چلم بھری۔ دونوں پینے لگے۔ یہ چماروں کا مکھیا بڑا بدمعاش آدمی تھا۔ سب کسان اُس سے تھر تھر کانپتے تھے۔ جھینگر نے چلم پیتے پیتے کہا۔ آج کل پھاگ داگ نہیں ہوتا کیا؟ سنائی نہیں دیتا۔!

ہری ہر۔ پھاگ کیا ہو؟ پیٹ کے دھندے سے چھٹی ہی نہیں ملتی۔ کہو تمہاری آج کل کیسی کٹتی ہے؟

جھینگر۔ کیا کٹتی ہے۔ نکٹا جیا برے حوال! دن بھر کارخانے میں مجوری کرتے ہیں تو چولھا جلتا ہے۔ چاندی تو آج کل بدھو کی ہے۔ رکھنے کو جگہ نہیں ملتی۔ نیا گھر بنا

بھیڑیں اور لی ہیں - اب گرہ پرویش (داخلہ مکان) کی دھوم ہے - ساتوں گاؤں میں نیوتے کی سپاری جائے گی۔

ہری ہر - لچھمی میا آتی ہیں تو آدمی کی آنکھوں میں سیل (مروّت) آجاتی ہے - مگر اس کو دیکھو دھرتی پہ پاؤں نہیں دھرتا - بولتا ہے تو اینٹھ کر بولتا ہے۔

جھینگر - کیوں نہ اینٹھے ؟ اس گاؤں میں کون ہے اس کی ٹکر کا ؟ پر یار، یہ انیائے تو نہیں دیکھا جاتا - جب بھگوان دیں تو سر جھکا کر چلنا چاہئے - یہ نہیں کہ اپنے برابر کسی کو سمجھے ہی نہیں - اس کی ڈینگ سُنتا ہوں تو بدن میں آگ لگ جاتی ہے - کل کا بانی، آج کا سیٹھ - چلا ہے ہمیں سے اکڑنے - ابھی کل لنگوٹی لگائے کھیتوں میں کوّے ہانکا کرتا تھا - آج ان کا آسمان میں دیا جلتا ہے۔

ہری ہر - کہو تو جوگ جاگ کروں۔

جھینگر - کیا کرو گے ! اسی ڈر سے تو وہ گائے بھینس نہیں پالتا۔

ہری ہر - بھیڑیں تو ہیں۔

جھینگر - کیا بگلا مارے پکھنا ہاتھ۔

ہری ہر - پھر تمہیں سوچو۔

جھینگر - ایسی جگت نکالو کہ پھر پنپنے نہ پائے۔

اس کے بعد دونوں میں کانا پھوسی ہونے لگی - یہ ایک عجیب بات ہے کہ نیکی میں جتنی نفرت ہے، بدی میں اتنی ہی رغبت - عالم عالم کو دیکھ کر، سادھو سادھو کو دیکھ کر، شاعر شاعر کو دیکھ کر جلتا ہے - ایک دوسرے کی صورت نہیں دیکھنا چاہتا - مگر جواری جواری کو دیکھ کر، شرابی شرابی کو دیکھ کر ہمدردی جتاتا ہے، مدد کرتا ہے

ایک پنڈت جی اگر اندھیرے میں ٹھوکر کھا کر گر پڑیں تو دوسرے پنڈت جی اُنھیں اُٹھانے کے بجائے دو ٹھوکریں اور لگائیں گے کہ وہ پھر اُٹھ ہی نہ سکیں۔ مگر ایک چور پر آفت آتے دیکھ کر دوسرا چور اُس کی آڑ کر لیتا ہے۔ بدی سے سب نفرت کرتے ہیں۔ اس لئے بدوں میں باہمی محبت ہوتی ہے۔ نیکی کی ساری دنیا تعریف کرتی ہے اس لئے نیکوں میں مخالفت ہوتی ہے۔ چور کو مار کر چور کیا پائے گا؟ نفرت۔ عالم کی توہین کر کے عالم کیا پائے گا؟ نیک نامی۔ جھینگر اور ہری ہرن نے صلاح کر لی۔ سازش کی تدبیر سوچی گئی۔ اُس کا نقشہ، وقت اور طریقہ طے کیا گیا۔ جھینگر چلا تو اکڑا جاتا تھا۔ مار لیا دشمن کو، اب کہاں جاتا ہے۔!

دوسرے روز جھینگر کام پر جانے لگا تو پہلے بدھو کے گھر پہنچا۔ بدھو نے پوچھا کیوں آج نہیں گئے گیا؟

جھینگر۔ جا تو رہا ہوں۔ تم سے یہی کہنے آیا تھا کہ میری بھیا کو اپنی بھیڑوں کے ساتھ کیوں نہیں چرا دیا کرتے؟ بیچاری کھونٹے پر بندھی مری جاتی ہے، نہ گھاس نہ چارہ، کیا کھلا دیں؟

بدھو۔ بھیّا! میں گائے بھینس نہیں رکھتا۔ چماروں کو جانتے ہو، یہ ایک ہی ہتیارے ہوتے ہیں۔ اُسی ہری ہرن نے میری دو گائیں مار ڈالیں۔ نہ جانے کیا کھلا دیتا ہے۔ تب سے کان پکڑے کہ اب گائے بھینس نہ پالوں گا۔ لیکن تمہاری ایک ہی بچھیا ہے۔ اس کا کوئی کیا کرے گا؟ جب چاہو پہنچا دو۔

یہ کہہ کر بدھو اپنے مکان والی دعوت کا سامان اسے دکھانے لگا۔ گھی، شکر، میدہ، ترکاری سب منگا رکھا تھا۔ صرف ست نرائن کی کتھا کی دیر تھی۔ جھینگر کی آنکھیں

کھل گئیں - ایسی تیاری نہ اس نے خود کبھی کی تھی اور نہ کسی کو کرتے دیکھی تھی - مزدوری کرکے گھر کو لوٹا تو سب سے پہلا کام جو اس نے کیا وہ اپنی بچھیا کو بدھو کے گھر پہنچانا تھا - اسی رات کو بدھو کے یہاں ست نرائن کی کتھا ہوئی : برمھ بھوج بھی کیا گیا - ساری رات برہمنوں کی تواضع تکریم میں گزری - بھیڑوں کے گلے میں جانے کا موقع ہی نہ ملا - علی الصباح کھانا کھاکر اُٹھا ہی تھا (کیونکہ رات کا کھانا صبح ملا) کہ ایک آدمی نے آکر خبر دی - بدھو تم یہاں بیٹھے ہو ادھر بھیڑوں میں بچھیا مری پڑی ہے - بھلے آدمی اُس کی پگھیا بھی نہیں کھولی تھی -

بدھو نے سُنا اور گویا ٹھوکر لگ گئی - جھینگر بھی کھانا کھاکر وہیں میٹھا تھا - بولا ہائے میری بچھیا - چلو ذرا دیکھوں تو، میں نے تو پگھیا نہیں لگائی تھی - اُسے بھیڑوں میں پہنچاکر اپنے گھر چلا گیا تھا - تم نے یہ پگھیا کب لگادی ؟

بدھو - بھگوان جانے جو میں نے اُس کی پگھیا دیکھی بھی ہو، میں تو تب سے بھیڑوں میں گیا ہی نہیں -

جھینگر - جاتے نہ تو پگھیا کون لگا دیتا، گئے ہوگے یاد نہ آتی ہوگی -

ایک برہمن - مری تو بھیڑوں ہی میں نا ؟ دنیا تو یہی کہے گی کہ بدھو کی غفلت سے اُس کی موت ہوئی چاہے پگھیا کسی کی ہو -

ہری ہر - میں نے کل سانجھ کو انھیں بچھیا کو باندھتے دیکھا تھا -

بدھو - مجھے ؟

ہری ہر - تم نہیں لاٹھی کاندھے پر رکھے بچھیا کو باندھ رہے تھے ؟

بدھو - بڑا سچا ہے تو، تو نے مجھے بچھیا کو باندھتے دیکھا تھا ؟

HaSnain Sialvi

ہری ہر - تو مجھ پر کاہے کو بگڑتے ہو بھائی ؟ تم نے نہیں باندھی تھی تو نہیں سہی -

برہمن - اس کا نشچے کرنا ہوگا ، گئو ہتیا کا پراشچت کرنا پڑے گا - کچھ ہنسی ٹھٹھا ہے !

جھینگر - مہاراج ، کچھ جان بوجھ کر تو باندھی نہیں -

برہمن - اس سے کیا ہوتا ہے ؟ ہتیا اسی طرح لگتی ہے - کوئی گئو کو مارنے نہیں جاتا -

جھینگر - ہاں گئوؤں کو کھولنا باندھنا ہے تو جوکھم کا کام -

برہمن - شاستروں میں اسے مہا پاپ کہا ہے - گئو کی ہتیا برہمن کی ہتیا سے کم نہیں -

جھینگر - ہاں ، پھر گئو تو ٹھہری ہی - اسی سے نہ ان کا مان (زور) ہے جو ماتا سو گئو - لیکن مہاراج چوک ہو گئی - کچھ ایسا کیجئے کہ بیچارہ تھوڑے میں نپٹ جائے -

بدھو کھڑا سن رہا تھا کہ خواہ مخواہ میرے سر گو ہتیا کا الزام تھوپا جا رہا ہے - جھینگر کی چالاکی بھی سمجھ رہا تھا - میں لاکھ کہوں کہ میں نے بچھیا نہیں باندھی ، پرمانے گا کون ؟ لوگ یہی کہیں گے کہ پراشچت سے بچنے کے لئے ایسا کہہ رہا ہے -

برہمن دیوتا کا بھی پراشچت کرانے میں فائدہ تھا - بھلا ایسے موقعے پر کب چوکنے والے تھے - نتیجہ یہ ہوا کہ بدھو کو ہتیا لگ گئی - برہمن بھی اس سے جل رہے تھے - کسر نکالنے کا موقع ملا - تین ماہ تک بھیک مانگنے کی سزا دی گئی - پھر سات تیرتھوں کی جاترا ، اس پر پانچ سو برہمنوں کا کھلانا اور پانچ گایوں کا دان - بدھو نے سنا تو ہوش اڑ گئے - رونے

لگا تو سزا گھٹا کر دو ماہ کر دی گئی - اس کے سوا کوئی رعایت نہ ہو سکی - نہ کہیں اپیل نہ کہیں فریاد - بیچارے کو یہ سزا قبول کرنی پڑی -

بدھو نے بھیڑیں ایشور کو سونپیں - لڑکے چھوٹے تھے - عورت اکیلی کیا کرتی ؟ غریب جا کر دروازوں پر کھڑا ہوتا اور منہ چھپائے ہوئے کہتا " گائے کی باچھی دیو بن باس" بھیک تو مل جاتی مگر بھیک کے ساتھ دو چار سخت اور توہین آمیز فقرے بھی سننے پڑتے دن کو جو کچھ پاتا اُسی کو شام کے وقت کسی درخت کے نیچے پکا کر کھا لیتا اور پڑ رہتا - تکلیف کی اُس کو پروا نہ تھی - بھیڑوں کے ساتھ تمام دن چلتا ہی تھا، درخت کے نیچے سوتا ہی تھا، کھانا بھی اس سے کچھ ہی بہتر ملتا تھا - شرم تھی بھیک مانگنے کی - خصوصاً جب کوئی بدمزاج عورت یہ طعنے دیتی کہ روٹی کھانے کا اچھا ڈھنگ نکالا ہے تو اُسے دلی قلق ہوتا تھا - مگر کیا کرے ؟

دو ماہ بعد وہ گھر واپس آیا - بال بڑھے ہوئے تھے - کمزور اس قدر کہ گویا ساٹھ سال کا بوڑھا ہو - تیرتھ جانے کے لئے روپیوں کا بندوبست کرنا تھا - گڈریوں کو کون مہاجن قرض دے - بھیڑوں کا بھروسہ کیا ؟ کبھی کبھی وبا پھیلتی ہے تو رات بھر میں گلے کا گلہ صاف ہو جاتا ہے - اُس پر جیٹھ کا مہینہ، جب بھیڑوں سے کوئی آمدنی ہونے کی اُمید نہیں - ایک تیلی راضی بھی ہوا تو دو آنے فی روپیہ سود پر - آٹھ ماہ میں سود اصل کے برابر ہو جائے گا - یہاں قرض لینے کی ہمت نہ پڑی - ادھر دو مہینوں میں کتنی ہی بھیڑیں چوری چلی گئیں - لڑکے چَرانے لے جاتے تھے - دوسرے گاؤں والے چپکے سے دو ایک بھیڑیں کسی کھیت یا گھر میں چھپا دیتے اور بعدہٗ مار کر کھا جاتے - لڑکے بیچارے ایک تو نہ پکڑ سکتے اور جو دیکھ بھی لیتے تو لڑیں کیسے ؟ سارا گاؤں ایک ہو جاتا تھا -

ایک ماہ میں تو بھیڑیں آدھی بھی نہ رہ جاویں گی۔ بڑا مشکل مسئلہ تھا۔ مجبوراً بدھو نے ایک قصاب کو بُلایا اور سب بھیڑیں اُس کے ہاتھ فروخت کر ڈالیں۔ پانچسو روپے بنے۔ اُن میں سے دوسو لے کر وہ تیرتھ جاترا کرنے گیا۔ بقیہ روپے برہمو بھوج کے لئے چھوڑ گیا۔

بدھو کے جانے پر اُس کے مکان میں دو بار نقب زنی ہوئی۔ مگر یہ خیریت ہوئی کہ جاگ پڑ جانے کی وجہ سے روپے بچ گئے۔

(۶)

ساون کا مہینہ تھا، چاروں طرف ہریالی پھیلی ہوئی تھی۔ جھینگر کے بیل نہ تھے، کھیت بٹائی پر دے دیئے تھے۔ بدھو پراشچت سے فارغ ہو گیا تھا اور اُس کے ساتھ ہی مایا کے پھندے سے بھی آزاد ہو گیا تھا۔ نہ جھینگر کے پاس کچھ تھا نہ بدھو کے پاس۔ کون کس سے جلتا اور کس لئے جلتا؟

سَن کی کَل بند ہو جانے کے سبب جھینگر اب بیلداری کا کام کرتا تھا۔ شہر میں ایک بڑا دھرم شالہ بن رہا تھا۔ ہزاروں مزدور کام کرتے تھے۔ جھینگر بھی اُنہیں میں تھا۔ ساتویں روز مزدوری کے پیسے لے کر گھر آتا تھا اور رات بھر رہ کر سویرے پھر چلا جاتا تھا۔

بدھو بھی مزدوری کی تلاش میں یہیں پہنچا۔ جمعدار نے دیکھا کہ کمزور آدمی ہے سخت کام تو اس سے ہو نہ سکے گا۔ کاریگروں کو گارا پہنچانے کے لئے رکھ لیا۔ بدھو سر پر تاشلا رکھے گارا لینے گیا تو جھینگر کو دیکھا۔ رام رام ہوئی۔ جھینگر نے گارا بھر دیا۔ بدھو نے اُٹھا لیا۔ دن بھر دونوں اپنا اپنا کام کرتے رہے۔

شام کو جھینگر نے پوچھا۔ کچھ بناؤ گے نا؟

بدھو۔ نہیں تو کھاؤں گا کیا؟

جھینگر۔ میں تو ایک جون چبینا کر لیتا ہوں۔ اس جون ستو کھاتا ہوں۔ کون جھنجھٹ کرے۔

بدھو۔ اِدھر اُدھر لکڑیاں پڑی ہوئی ہیں۔ بٹور لاؤ۔ آٹا گھر سے لیتا آیا ہوں۔ گھر ہی میں پسوا لیا تھا۔ یہاں تو بڑا مہنگا ملتا ہے۔ اس پتھر والی چٹان پر آٹا گوندھے لیتا ہوں۔ تم تو میرا بنایا کھاؤ گے نہیں۔ اس لئے تمہیں روٹیاں سینکو، میں روٹیاں بناتا جاؤں گا۔

جھینگر۔ تو ابھی تو نہیں ہے۔

بدھو۔ تو سے بہت ہیں۔ یہی گارے کا تسلا مانجھے لیتا ہوں۔

آگ جلی، آٹا گوندھا گیا، جھینگر نے کچی پکی روٹیاں تیار کیں۔ بدھو پانی لایا۔ دونوں نے نمک مرچ کے ساتھ روٹیاں کھائیں۔ پھر چلم بھری گئی۔ دونوں پتھر کی سلوں پر لیٹے اور چلم پینے لگے۔

بدھو نے کہا تمہاری ایکھ میں آگ میں نے لگائی تھی۔

جھینگر نے مذاق آمیز لہجہ میں کہا۔ جانتا ہوں۔

ذرا دیر بعد جھینگر بولا۔ بچھیا میں نے ہی باندھی تھی اور ہری ہر نے اُسے کچھ کھلا دیا تھا۔ بدھو نے بھی اُسی لہجہ میں کہا جانتا ہوں — پھر دونوں سو گئے۔

[پریم چالیسی]

HaSnain Sialvi

قزاقی

میری بچپن کی یادداشتوں میں قزاقی ایک نہ فراموش ہونے والا شخص ہے آج سے چالیس برس گزر گئے مگر قزاقی کا تصور ابھی تک آنکھوں میں ہے۔ میں ان دنوں اپنے والد کے ساتھ ضلع اعظم گڈھ کی ایک تحصیل میں تھا۔ قزاقی ذات کا پاسی تھا، بڑا ہی ہنس مکھ، بڑا ہی ہمت ور، بڑا ہی زندہ دل۔ وہ روزانہ ڈاک کا تھیلا لے کر آتا۔ رات بھر رہتا اور سویرے ڈاک لے کر جاتا۔ شام کو پھر اُدھر سے ڈاک لے کر آجاتا۔ میں تمام دن بے صبری سے اس کا منتظر رہتا۔ جونہی چار بجے، بے چین ہو کر سڑک پر جا کر کھڑا ہو جاتا۔ اور تھوڑی دیر میں قزاقی کندھے پر بلم رکھے اُس کے گھونگھر بجاتا، دور سے دوڑتا ہوا آتا دکھائی دیتا۔ وہ سانولے رنگ کا مضبوط۔ اور لمبے قد کا جوان تھا۔ اُس کا جسم سانچے میں ایسا ڈھلا ہوا کہ چابکدست مصور بھی اس میں کوئی عیب نہ نکال سکتا تھا۔ اُس کی چھوٹی چھوٹی مونچھیں، اُس کے سڈول چہرے پر

بہت ہی بھلی لگتی تھیں۔ مجھے دیکھ کر وہ اور تیز دوڑنے لگتا۔ اس کے بدن کے گھونگھرو اور زور سے بجنے لگتے۔ اور میرا دل فرطِ مسرت سے اور زیادہ اُچھلنے لگتا۔ خوشی کی اُمنگ میں میں بھی دوڑ جاتا اور ایک لمحہ میں قزاقی کا کندھا میرا سنگھاسن بن جاتا۔ وہ مقام میری تمناؤں کا بہشت تھا۔ بہشت والوں کو بھی شاید وہ متحرک سرور نہ ملتا ہوگا، جو مجھے قزاقی کے چوڑے کندھوں پہ ملتا تھا۔ دنیا میری نگاہوں میں ہیچ ہو جاتی اور جب قزاقی مجھے اپنے کندھے پر لئے ہوئے دوڑنے لگتا۔ کہ گویا میں ہوا کے گھوڑے پر اُڑا چلا جا رہا ہوں۔

قزاقی ڈاکخانہ میں پہنچتا تو پسینہ سے تر ہو جاتا لیکن آرام کرنے کی اُسے عادت نہ تھی۔ تھیلا رکھتے ہی وہ ہم لوگوں کو لے کر میدان میں نکل جاتا۔ کبھی ہمارے ساتھ کھیلتا، کبھی برہے گا کر سناتا اور کبھی کہانیاں کہتا۔ اُسے چوری، ڈاکہ، مار پیٹ بھوت پریت کے صدہا قصے یاد تھے۔ میں یہ قصے سُن کر حیرت آمیز سرور میں محو ہو جاتا اس کے قصوں کے چور ڈاکو سچے بہادر ہوتے تھے۔ جو امراء کو لوٹ کر غربا و مساکین کی پرورش کرتے تھے۔ مجھے اُن سے نفرت کی بجائے عقیدت ہوتی تھی۔

(۲)

ایک روز قزاقی کو ڈاک کا تھیلا لے کر آنے میں دیر ہو گئی۔ آفتاب غروب ہو گیا اور وہ نظر نہ آیا۔ میں کھویا ہوا سا سڑک پر دور دور تک آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتا تھا مگر وہ مانوس صورت نظر نہ آتی تھی۔ کان لگا کر سُنتا تھا مگر "جھن جھن" کی وہ مسرت افزا آواز نہ سُنائی دیتی تھی۔ روشنی کے ساتھ میری اُمید بھی غائب ہوتی جاتی تھی۔ ادھر سے کسی کو آتے دیکھتا تو پوچھتا — قزاقی آتا ہے؟ مگر یا تو کوئی سُنتا ہی

نہ تھا یا صرف سر ہلا دیتا تھا۔

دفعتاً "جھُن جھُن" کی آواز کانوں میں آئی۔ مجھے اندھیرے میں چاروں طرف بھوت ہی بھوت نظر آتے تھے حتیٰ کہ والدہ کے کمرے میں طاق پر رکھی ہوئی مٹھائی بھی اندھیرا ہونے پر میرے لئے قابلِ ترک ہو جاتی تھی۔ مگر وہ آواز سُنتے ہی اُس طرف زور سے دوڑا۔ ہاں وہ قزاقی ہی تھا۔ اُسے دیکھتے ہی میری بے قراری غصّے میں تبدیل ہو گئی۔ میں اُسے مارنے لگا پھر روٹھ کر الگ کھڑا ہو گیا۔

قزاقی نے ہنس کر کہا۔ مارو گے تو میں ایک چیز لایا ہوں، وہ نہ دوں گا۔

میں نے ہمت کر کے کہا — جاؤ نہ دینا، میں لوں گا ہی نہیں۔

قزاقی۔ ابھی دکھا دوں تو دوڑ کر گود میں اُٹھا لو گے۔

میں نے بگھل کر کہا — اچھا دکھا دو۔

قزاقی۔ تو آ کر میرے کندھے پر بیٹھ جاؤ، بھاگ چلوں۔ آج بہت دیر ہو گئی بابو جی بگڑ رہے ہوں گے۔ میں نے اکڑ کر کہا۔ پہلے دکھا دو —

میری فتح ہوئی۔ اگر قزاقی کو دیر کا خوف ہوتا اور ایک منٹ بھی زیادہ ٹھہر سکتا تو یہ پانسہ پلٹ جاتا۔ اُس نے کوئی چیز دکھلائی جسے وہ ایک ہاتھ سے سینے سے چمٹائے ہوئے تھا۔ لانبا منہ تھا اور آنکھیں چمک رہی تھیں۔

میں نے دوڑ کر اُسے قزاقی کی گود سے لے لیا۔ وہ ہرن کا بچہ تھا۔ آہ میری خوشی کا کون اندازہ کرے گا؟ اس وقت سے مشکل امتحانات پاس کئے، بڑا عہدہ بھی پایا، رائے بہادر بھی ہوا مگر ایسی خوشی پھر نصیب ہوئی۔ میں اُسے گود میں لئے اُس کے نرم و نازک بس سے لطف اندوز ہوتا ہوا مکان کی طرف دوڑا۔ قزاقی کو آنے میں

کیوں اتنی دیر ہوئی، اس کا خیال ہی نہ رہا۔

میں نے پوچھا۔ یہ کہاں ملا قزاقی؟

قزاقی۔ بھیا۔ یہاں سے تھوڑی سی دُور پر ایک چھوٹا سا جنگل ہے اُس میں بہت سے ہرن ہیں۔ میرا بہت جی چاہتا تھا کہ کوئی بچہ مل جائے تو تمہیں دوں۔ آج یہ بچہ ہرنوں کے جھنڈ کے ساتھ دکھائی دیا۔ میں جھنڈ کی طرف دوڑا تو سب کے سب بھاگے۔ یہ بچہ بھی بھاگا۔ پر میں نے پیچھا نہ چھوڑا اور ہرن تو بہت دور نکل گئے پر یہی بچہ پیچھے رہ گیا۔ میں نے اُسے پکڑ لیا۔ اسی سے تو اتنی دیر ہوئی۔

اس طرح باتیں کرتے ہم دونوں ڈاک خانہ پہنچے۔ بابو جی نے مجھے نہ دیکھا۔ ہرن کے بچے کو بھی نہ دیکھا۔ قزاقی ہی پر اُن کی نگاہ پڑی۔ بگڑ کر بولے۔

آج اتنی دیر کہاں لگائی؟ اب تھیلا لے کر آیا ہے۔ اسے لے کر کیا کروں؟ ڈاک تو چلی بھی گئی۔ بتا تو نے اتنی دیر کہاں لگائی؟

قزاقی کے منہ سے آواز نہ نکلی۔

بابو جی نے کہا۔ تجھے شاید اب نوکری نہیں کرنی ہے۔ رذیل ہے نہ، پیٹ بھرا تو موٹا ہو گیا۔ جب بھوکوں مرنے لگے گا تب آنکھیں کھلیں گی۔

قزاقی خاموش کھڑا رہا۔

بابو جی کا غصہ اور بڑھا، بولے۔ اچھا تھیلا رکھ دے اور گھر کی راہ لے۔ سؤر، اب ڈاک لے کے آیا ہے۔ تیرا کیا بگڑے گا؟ جہاں چاہے گا مزدوری کرے گا۔ مالکے تو میرے جائے گی، جواب تو مجھ سے طلب ہو گا۔

قزاقی نے رونی صورت بنا کر کہا۔ سرکار اب کبھی دیر نہ ہو گی۔

بابو - آج کیوں دیر کی - اس کا جواب دے ؟

قزاقی کے پاس اس کا کوئی جواب نہ تھا۔ تعجب تو یہ تھا کہ میری زبان بھی بند ہوگئی - بابو جی بڑے غصہ ور تھے۔ اُنھیں کام بہت کرنا پڑتا تھا۔ اسی وجہ سے بات بات پر جھنجھلا پڑتے تھے۔ میں تو اُن کے سامنے کبھی جاتا ہی نہ تھا۔ وہ بھی مجھے کبھی پیار نہ کرتے تھے۔ دن میں وہ صرف دو بار ایک ایک گھنٹہ کے لئے کھانا کھانے جاتے تھے، باقی تمام دن دفتر میں لکھا کرتے۔ اُنھوں نے بار بار ایک اسسٹنٹ کے لئے افسروں سے درخواست کی تھی۔ مگر اس کا کوئی نتیجہ نہ ہوا تھا۔ حتیٰ کہ تعطیل کے دن بھی بابو جی دفتر ہی میں رہتے تھے۔ صرف والدہ اُن کے غصے کو فرو کرنا جانتی تھیں۔ مگر وہ دفتر میں کیسے آئیں ؟ بیچارہ قزاقی اُسی وقت میرے دیکھتے دیکھتے نکال دیا گیا۔ اُس کا بلم، چپڑاس اور صافہ چھین لیا گیا اور اُسے ڈاکخانے سے نکل جانے کا نادرشاہی حکم سُنا دیا گیا۔ آہ، اُس وقت میرا ایسا جی چاہتا تھا کہ میرے پاس سونے کی لنکا ہوتی تو قزاقی کو دے دیتا۔ اور بابو جی کو دکھلا دیتا کہ آپ کے نکال دینے سے قزاقی کا بال بھی بیکا نہیں ہوا۔ کسی سپاہی کو اپنی تلوار پر جتنا غرور ہوتا ہے اتنا ہی غرور قزاقی کو اپنی چپڑاس پر تھا۔ جب وہ چپڑاس کھول رہا تھا تو اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ اور اس سارے فساد کی جڑ وہ نازک شے تھی، جو میری گود میں منہ چھپائے ایسے آرام سے بیٹھی ہوئی تھی گویا ماں کی گود میں ہو۔ جب قزاقی چلا تو میں بھی آہستہ آہستہ اُس کے پیچھے چلا۔ میرے گھر کے دروازے پر آکر قزاقی نے کہا۔ بھیا! اب گھر جاؤ، سانجھ ہوگئی۔

قزاقی پھر بولا۔ بھیا! میں کہیں باہر تھوڑا ہی چلا جاؤں گا۔ پھر آؤں گا اور

تمہیں کندھے پر بٹھا کر دوڑاؤں گا۔ بابو جی نے نوکری لے لی ہے تو کیا اتنا بھی نہ کرنے دیں گے۔ تم کو چھوڑ کر میں کہیں نہ جاؤں گا۔ بھیا، جا کر اماں سے کہہ دو، کجا کی جاتا ہے، اُس کا کہا سُنا ماپھ کریں۔ میں دوڑا ہوا گھر گیا۔ گھر ماں سے کچھ کہنے کے بجائے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ ماں رسوئی سے باہر آکر پوچھنے لگیں۔ کیا ہوا بیٹا؟ کس نے مارا؟ بابو جی نے کچھ کہا ہے؟ اچھا، رہ تو جاؤ، آج گھر آتے ہیں تو پوچھتی ہوں۔ جب دیکھو میرے لڑکے کو مارا کرتے ہیں۔ چپ رہو بیٹا، اب تم اُن کے پاس کبھی مت جانا۔

میں نے بڑی مشکل سے آواز سنبھال کر کہا — قزاقی ..... ماں نے سمجھا قزاقی نے مارا ہے۔ اچھا آنے دو قزاقی کو۔ دیکھو کھڑے کھڑے نکلوائے دیتی ہو۔ بے کارہ ہو کر میرے راجہ بیٹے کو مارے۔ آج ہی تو صافہ بلم سب چھنوائے لیتی ہوں۔ واہ!

میں نے جلدی سے کہا۔ نہیں، قزاقی نے نہیں مارا۔ بابو جی نے اُسے نکال دیا۔ اُس کا صافہ، بلم چھین لیا۔ چپڑاس بھی لے لی۔

ماں۔ یہ تمہارے بابو جی نے بہت بُرا کیا ہے۔ وہ بیچارہ اپنے کام میں مستعد رہتا ہے، پھر اُسے کیوں نکالا؟

میں نے کہا۔ آج اُسے دیر ہو گئی تھی۔

یہ کہہ کر میں نے ہرن کے بچے کو گود سے اُتار دیا۔ گھر میں اُس کے بھاگ جانے کا اندیشہ نہ تھا۔ اب تک ماں کی نگاہ بھی اُس پر نہ پڑی تھی۔ اُسے پھدکتے دیکھ کر وہ یکایک چونک پڑیں اور لپک کر میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ کہیں وہ خوفناک جانور مجھے کاٹ نہ لے۔ میں کہاں تو پھوٹ پھوٹ کر رو رہا تھا، کہاں ماں کی اس گھبراہٹ پر کھلکھلا کر

کر ہنس پڑا۔

ماں - ارے یہ تو ہرن کا بچہ ہے، کہاں ملا ؟

میں نے ہرن کے بچے کا سارا ماجرا اور اُس کے خوفناک نتیجے کا ابتدا سے انتہا تک کہہ سنایا — اماں! یہ اتنا تیز بھاگتا تھا کہ کوئی دوسرا ہوتا تو پکڑ ہی نہ سکتا، سَن سَن ہوا کی طرح اُڑتا چلا جاتا۔ قزاقی پانچ چھ گھنٹے تک اُس کے پیچھے دوڑتا رہا، تب کہیں جا کر بچہ جی ملے۔ اماں! قزاقی کی طرح کوئی دنیا میں نہیں دوڑ سکتا۔ اسی سے تو دیر ہو گئی۔ سو بابو جی نے بیچارے کو نکال دیا۔ چپراس، صافہ، بلم سب چھین لئے۔ اب بیچارہ کیا کرے گا؟ بھوکوں مر جائے گا۔

ماں نے پوچھا — کہاں ہے قزاقی، ذرا اُسے بلا تو لاؤ۔

میں نے کہا۔ باہر تو کھڑا ہے۔ کہتا ہے، اماں جی سے میرا کہا سُنا معاف کرا دینا۔

اب تک ماں میری باتوں کا مذاق سمجھ رہی تھیں۔ شاید وہ سمجھتی تھیں کہ بابو جی نے قزاقی کو ڈانٹا ہو گا۔ مگر میرا آخری جملہ سُن کر اُنھیں خیال ہوا کہ کہیں واقعی تو قزاقی برخاست نہیں کر دیا گیا۔ وہ باہر جا کر قزاقی قزاقی پکارنے لگیں۔ مگر قزاقی کا کہیں پتہ نہ تھا۔ میں نے بار بار پکارا اور رو رو کر پکارا مگر قزاقی وہاں نہ تھا۔

کھانا تو میں نے کھا لیا۔ بچے غم میں بھی کھانا نہیں ترک کرتے۔ خصوصاً جب بڑی بھی سامنے ہو۔ مگر بڑی رات تک پڑے پڑے سوچتا رہا میرے پاس پیسے ہوتے تو ایک لاکھ روپے قزاقی کو دے دیتا۔ اور کہتا کہ بابو جی سے کبھی مت بولنا۔ بیچارہ بھوکوں مر جائے گا۔ دیکھیں کل آتا ہے یا نہیں، اب کیا کرے گا آ کر؟ مگر آنے کو تو

کہہ گیا ہے - میں کل اُسے اپنے ساتھ کھانا کھلاؤں گا -
یہی ہوائی قلعے بناتے بناتے مجھے نیند آگئی

(۳)

دوسرے روز میں تمام دن اپنے ہرن کے بچے کی آؤ بھگت میں مشغول رہا - پہلے اُس کے نام رکھنے کی رسم ادا ہوئی - مُنّو نام رکھا گیا - پھر میں نے اُس کا اپنے جملہ دوستوں اور ہم سبق لڑکوں سے تعارف کرایا - ایک ہی روز میں وہ مجھ سے اس قدر مانوس ہوگیا کہ میرے پیچھے پیچھے دوڑنے لگا - اتنی ہی دیر میں میں نے اسے اپنی زندگی میں ایک اہم جگہ دے دی - اپنے مستقبل میں بننے والے شاندار محل میں اُس کے لئے ایک علیحدہ کمرہ بنانے کا بھی تہیہ کرلیا - پلنگ، فنٹن وغیرہ کی بھی تجاویز کرلیں -

لیکن شام ہوتے ہی میں سب چھوڑ چھاڑ کر سڑک پر جا کھڑا ہوا اور قزاقی کی راہ دیکھنے لگا - یہ جانتا تھا کہ قزاقی نکال دیا گیا ہے، اب اسے یہاں آنے کی کوئی ضرورت نہیں رہی - پھر بھی نہ جانے کیوں مجھے یہ اُمید ہو رہی تھی کہ وہ آرہا ہے - یکایک مجھے خیال آیا کہ قزاقی بھوکوں مر رہا ہوگا - میں فوراً گھر گیا - والدہ چراغ جلا رہی تھیں - میں نے فوراً ایک ٹوکری میں آٹا نکالا اور آٹا ہاتھوں میں لپیٹے، ٹوکری سے گرتے ہوئے آٹے کی ایک لکیر بناتا ہوا بھاگا - آکر سڑک پر کھڑا ہوا ہی تھا کہ قزاقی سامنے سے آتا نظر پڑا - اس کے پاس بلم بھی تھا، کمر میں چپراس بھی تھی اور سر پر صافہ بھی بندھا ہوا تھا - اُس کے بلم میں ڈاک کا تھیلا بھی بندھا ہوا تھا - میں دوڑ کر اُس کی کمر سے لپٹ گیا اور متحیّر ہوکر بولا تمہیں چپراس اور بلم کہاں سے مل گیا - قزاقی!

قزاقی نے مجھے اُٹھا کر کندھے پر بٹھلاتے ہوئے کہا۔ وہ چپراس کس کام کی تھی بھیاّ، وہ تو گلامی کی چپراس تھی۔ یہ اپنی خوشی کی چپراس ہے۔ پہلے سرکار کا نوکر تھا، اب تمہارا نوکر ہوں۔

یہ کہتے کہتے اس کی نگاہ ٹوکری پر پڑی جو وہیں رکھی تھی، بولا — یہ آٹا کیسا ہے بھیاّ؟ میں نے شرماتے ہوئے کہا۔ تمہارے ہی لئے تو لایا ہوں۔ تم بھوکے ہوگے، آج کیا کھایا ہوگا؟

قزاقی کی آنکھیں تو میں نہ دیکھ سکا، اُس کے کندھے پر بیٹھا ہوا تھا۔ ہاں، اُس کی آواز سے معلوم ہوا کہ اس کا گلا بھر آیا ہے۔ بولا — بھیا! کیا روکھی روٹیاں کھاؤں گا۔ دال نمک گھی اور تو کچھ نہیں ہے۔

میں اپنے سہو پر بہت نادم ہوا۔ سچ تو ہے کہ بیچارہ روکھی روٹیاں کیسے کھائیگا؛ لیکن نمک دال اور گھی کیسے لاؤں؟ اب تو ماں چوکے میں ہوں گی۔ آٹا لے کر تو کسی طرح بھاگ آیا تھا۔ (ابھی تک مجھے نہ معلوم تھا کہ میری چوری پکڑ لی گئی، آٹے کی لکیر نے سراغ دے دیا ہے) اب یہ تین چیزیں کیسے لاؤں گا؟ ماں سے مانگوں گا تو کبھی نہ دیں گی۔ ایک ایک پیسے کے لئے تو گھنٹوں رُلاتی ہیں، اتنی سبھی چیزیں کیوں دینے لگیں۔ یکایک مجھے ایک بات یاد آئی۔ میں نے اپنی کتابوں کے بستہ میں کئی آنے پیسے رکھ چھوڑے تھے۔ مجھے پیسے جمع کر کے رکھنے میں بڑی خوشی ہوتی تھی۔ معلوم نہیں، اب وہ عادت کیوں تبدیل ہوگئی۔ اب بھی وہی حالت ہوتی تو شاید اس قدر فاقہ مست نہ رہتا۔ بابوجی مجھے پیار تو کبھی نہ کرتے تھے مگر پیسے خوب دیتے تھے۔ شاید اپنے کام میں مصروف رہنے کے سبب مجھ سے گلا چھڑانے کے لئے اسی

کام کو سب سے آسان سمجھتے تھے۔ انکار کرنے میں میرے رونے اور مچلنے کا اندیشہ تھا۔ اس بلا کو وہ دور ہی سے ٹال دیتے تھے۔ ماں کا مزاج اس کے ٹھیک برعکس تھا۔ انھیں میرے رونے اور مچلنے سے کسی کام میں خلل پڑنے کا خوف نہ تھا۔ آدمی لیٹے لیٹے دن بھر رونا سُن سکتا ہے، حساب لگاتے ہوئے زور کی آواز سے بھی دھیان بٹ جاتا ہے۔ اماں مجھے پیار تو بہت کرتی تھیں، مگر پیسے کا نام سُنتے ہی تیوریاں بدل جاتی تھیں۔ میرے پاس کتابیں نہ تھیں، ہاں ایک بستہ تھا۔ جس میں ڈاکخانہ کے دو چار فارم تہ کر کے کتابی صورت میں رکھے ہوئے تھے۔ میں نے سوچا۔ دال نمک اور گھی کے لئے کیا اتنے پیسے کافی نہ ہوں گے؟ میری تو مٹھی میں نہیں سماتے! خیر یہ فیصلہ کر کے میں نے کہا — اچھا مجھے اُتارو تو میں دال اور نمک کے پیسے لا دوں مگر روز آیا کرو گے نا؟

قزاقی۔ بھیا کھانے کو دو گے تو کیوں نہ آؤں گا۔

میں نے کہا — میں روز کھانے کو دوں گا۔

قزاقی بولا۔ تو میں بھی روز آؤں گا۔

میں نیچے اترا اور دوڑ کر اپنی ساری پونجی اُٹھا لایا۔ قزاقی کو روزانہ بلانے کے لئے اُس وقت میرے پاس کوہ نور ہیرا ہوتا تو اُسے بھی نذر کرنے میں مجھے تامل نہ ہوتا۔

قزاقی نے متحیر ہو کر پوچھا۔ یہ پیسے کہاں پائے بھیا؟

میں نے فخر سے کہا 'میرے ہی تو ہیں۔!

قزاقی۔ تمہاری اماں جی تم کو ماریں گی۔ کہیں گی کجا کی نے پھسلا کر منگوا لئے ہوں گے۔ بھیا، ان پیسوں کی مٹھائی لے لینا اور آٹا مٹکے میں رکھ دینا۔ میں بھوکوں نہیں مرتا۔

میرے دو ہاتھ ہیں، بھلا میں بھوکوں مر سکتا ہوں؟

میں نے ہر چند کہا کہ پیسے میرے ہیں لیکن قزاقی نے نہ لئے۔ اس نے بڑی دیر تک ادھر ادھر کی سیر کرائی۔ گیت سُنائے اور مجھے گھر پہنچا کر چلا گیا۔ میرے دروازہ پر آٹے کی ٹوکری بھی رکھ دی۔

میں نے مکان میں قدم رکھا ہی تھا کہ ماں نے ڈانٹ کر کہا۔ کیوں رے چور، تو آٹا کہاں لے گیا تھا؟ اب چوری کرنا سیکھتا ہے؟ بتا کس کو آٹا دے آیا۔ ورنہ تیری کھال اُدھیڑ کر رکھ دوں گی۔

میری نانی مر گئی۔ ماں غصے میں شیرنی ہو جاتی تھیں۔ میں سٹ پٹا کر بولا۔ کسی کو تو نہیں دے آیا۔

ماں۔ تو نے آٹا نہیں نکالا؟ دیکھو کتنا آٹا سارے صحن میں بکھرا پڑا ہے۔

میں خاموش کھڑا تھا۔ وہ کتنا ہی دھمکاتی تھیں، چمکارتی تھیں مگر میری زبان نہ کھلتی تھی۔ آنے والی مصیبت کے خوف سے جان سوکھ رہی تھی۔ یہاں تک بھی کہنے کی ہمت نہ پڑتی تھی کہ بگڑتی کیوں ہو؟ آٹا تو دروازے پر رکھا ہوا ہے۔ نہ اُٹھا کر لاتے بنتا تھا۔ گویا کام کرنے کی قوت ہی جاتی رہی تھی۔ گویا پیروں میں چلنے کی طاقت ہی نہ تھی۔ دفعتاً قزاقی نے پکارا۔ بہو جی آٹا یہ دروازے پر رکھا ہوا ہے۔ بھیا مجھے دینے کو لے گئے تھے۔

یہ سُنتے ہی ماں دروازے کی طرف چلی گئیں۔ قزاقی سے وہ پردہ نہ کرتی تھیں۔ اُنھوں نے قزاقی سے کوئی بات کی یا نہیں، یہ تو میں نہیں جانتا لیکن اماں جی خالی ٹوکری لئے ہوئے گھر میں آئیں۔ پھر کوٹھری میں جا کر صندوق سے کچھ نکالا اور دروازے کی طرف

گئیں۔ میں نے دیکھا ان کی مٹھی بند تھی۔ اب مجھ سے وہاں کھڑا نہ رہا گیا۔ ماں کے پیچھے پیچھے میں بھی گیا۔ ماں نے دروازے پر کئی بار پکارا مگر قزاقی چلا گیا تھا!

میں نے بڑی بہادری سے کہا۔ میں جا کر کھوج لاؤں؟

ماں نے کواڑ بند کرتے ہوئے کہا تم اندھیرے میں کہاں جاؤ گے؟ ابھی تو کھڑا تھا۔ میں نے کہا یہیں رہنا، میں آتی ہوں۔ تب تک نہ جانے کہاں کھسک گیا۔ بڑا سکوچی آدمی ہے۔ آٹا تو لیتا ہی نہ تھا۔ میں نے زبردستی اُس کے انگوچھے میں باندھ دیا۔ مجھے تو بیچارے پر بڑا ترس آتا ہے۔ نہ جانے غریب کے گھر کچھ کھانے کو ہے یا نہیں۔ روپے لائی تھی کہ دے دوں گی مگر نہ جانے کہاں چلا گیا۔

اب تو مجھے بھی ہمت ہوئی۔ میں نے اپنی چوری کی پوری داستان کہہ ڈالی۔ بچوں کے ساتھ سمجھدار بچے بن کر والدین اُن پر جتنا اثر ڈال سکتے ہیں، جتنی نصیحت دے سکتے ہیں، اتنا بڈھے بن کر نہیں۔

ماں نے کہا۔ تم نے مجھ سے پوچھ کیوں نہ لیا، کیا میں قزاقی کو تھوڑا سا آٹا نہ دے دیتی؟

میں نے اس کا کوئی جواب نہ دیا۔ دل میں کہا۔ اس وقت تمہیں قزاقی پر رحم آگیا ہے، جو چاہو دے ڈالو لیکن میں مانگتا تو مارنے دوڑتیں۔ ہاں یہ سوچ کر دل خوش ہوا کہ اب قزاقی بھوکوں نہ مرے گا۔ اماں جی اُسے روز کھانے کو دیں گی اور وہ روز مجھے کندھے پر بٹھا کر سیر کرائے گا۔

دوسرے روز میں دن بھر منو کے ساتھ کھیلتا رہا۔ شام کو سڑک پر جا کر کھڑا ہو گیا مگر اندھیرا ہو گیا اور قزاقی کا کہیں پتہ نہ تھا۔ چراغ جل گئے راستے میں سناٹا چھا گیا

مگر قزاقی نہ آیا۔

میں روتا ہوا گھر آیا۔ ماں نے پوچھا کیوں روتے ہو بیٹا؟ کیا قزاقی نہیں آیا؟ میں اور زور سے رونے لگا۔ ماں نے مجھے چھاتی سے لگا لیا۔ مجھے ایسا معلوم ہوا کہ ان کا گلا بھی بھر آیا ہے۔ اُنھوں نے کہا بیٹا چپ ہو جاؤ۔ میں کل کسی ہرکارے کو بھیج کر قزاقی کو بلاؤں گی۔

میں روتے ہی روتے سو گیا۔ صبح جونہی آنکھ کھلی، میں نے ماں سے کہا۔ قزاقی کو بلوا دو۔

ماں نے کہا۔ آدمی گیا ہے بیٹا، قزاقی آتا ہو گا۔ میں خوش ہو کر کھیلنے لگا۔ مجھے معلوم تھا کہ اماں جی جو بات کہتی ہیں اُسے پورا ضرور کرتی ہیں۔ انھوں نے سویرے ہی ایک ہرکارے کو بھیج دیا تھا۔ دس بجے جب میں منو کو لیے ہوئے گھر آیا تو معلوم ہوا کہ قزاقی اپنے گھر پر نہیں ملا۔ اس کی بیوی رو رہی تھی کہ نہ جانے کہاں چلے گئے۔ اُسے اندیشہ تھا کہ وہ کہیں بھاگ گیا ہے۔

بچوں کا دل کتنا نازک ہوتا ہے اس کا اندازہ دوسرا نہیں کر سکتا۔ اُن میں اپنے جذبات کو ظاہر کرنے کے لئے الفاظ نہیں ہوتے۔ اُنھیں یہ بھی معلوم نہیں ہوتا کہ کون سی بات اُنھیں بے چین کر رہی ہے۔ کون سا کانٹا اُن کے دل میں کھٹک رہا ہے۔ کیوں بار بار اُنھیں رونا آتا ہے۔ کیوں وہ من مارے بیٹھے ہیں، کھیلنے میں جی نہیں نہیں لگتا۔ میری بھی یہی حالت تھی کبھی گھر میں آتا کبھی باہر جاتا، کبھی سڑک پر جا پہنچتا۔ آنکھیں قزاقی کو ڈھونڈ رہی تھیں۔ وہ کہاں چلا گیا؟ کہیں بھاگ تو نہیں گیا؟ تیسرے پہر کو گم شدہ سا سڑک پر کھڑا تھا۔ یکایک میں نے قزاقی کو ایک گلی

میں دیکھا۔ ہاں، قزاقی ہی تھا! میں اُس کی طرف پکارتا ہوا دوڑا مگر گلی میں اُس کا پتہ نہ تھا۔ نہ جانے کدھر غائب ہو گیا۔ میں نے گلی کو اس سرے سے اُس سرے تک دیکھا مگر کہیں قزاقی کی بُو تک نہ ملی۔

گھر جاکر میں نے ماں سے یہ بات کہی۔ مجھے ایسا معلوم ہوا کہ وہ یہ بات سُن کر بہت متفکر ہو گئیں۔ اُس کے بعد دو تین روز تک قزاقی نہ دکھائی دیا۔ میں بھی اب اُس کو کچھ کچھ بھولنے لگا۔ بچے جتنی محبت کرتے ہیں بعد کو اتنے ہی بے اعتنا بھی ہو جاتے ہیں۔ جس کھلونے پر جان دیتے ہیں اُسی کو دو چار روز بعد پٹک کر توڑ بھی ڈالتے ہیں۔

دس بارہ روز اور گزر گئے۔ دوپہر کا وقت تھا۔ باوجی کھانا کھا رہے تھے، میں منّو کے پیروں میں پیتل کی پہنچنیاں باندھ رہا تھا۔ ایک عورت گھونگھٹ نکالے نکالے آئی اور صحن میں کھڑی ہو گئی۔ اس کے کپڑے پھٹے ہوئے اور میلے تھے۔ مگر گوری خوبصورت عورت تھی۔ اُس نے مجھ سے پوچھا، بھیّا، بہوجی کہاں ہیں؟ میں نے اُس کے پاس جاکر اُس کا مُنہ دیکھتے ہوئے کہا۔ تم کون ہو؟ کیا بیچتی ہو؟

عورت۔ کچھ نہیں بیچتی ہوں۔ تمہارے لئے یہ کمل گٹے لائی ہوں بھیا۔ تمہیں تو کمل گٹے بہت اچھے لگتے ہیں نا؟ میں نے اُس کے ہاتھوں سے لٹکتی ہوئی پوٹلی کو شوق بھری نگاہوں سے دیکھ کر پوچھا۔ کہاں سے لائی ہو۔ دکھیں۔

عورت۔ تمہارے ہرکارے نے بھیجا ہے۔

میں نے اُچھل کر پوچھا — قزاقی نے؟

عورت نے سر ہلا کر ہاں کہا اور پوٹلی کھولنے لگی۔ اتنے میں ماں بھی رسوئی سے نکل

آئیں - اس نے ماں کے پیر چھوئے۔ ماں نے پوچھا تو قزاقی کی گھر والی ہے ؟

عورت نے سر جھکا لیا۔

ماں - آج کل قزاقی کیا کرتا ہے ؟

عورت نے رو کر کہا۔ بہو جی، جس دن سے آپ کے پاس سے آٹالے کر گئے ہیں۔ اُسی دن سے بیمار پڑے ہیں۔ بس بھیّا بھیّا کیا کرتے ہیں۔ بھیا ہی میں اُن کا من بسا رہتا ہے۔ چونک چونک کر بھیا بھیا کہتے ہوئے دروازے کی طرف دوڑتے ہیں۔ نہ جانے اُنھیں کیا ہو گیا ہے بہو جی! ایک دن مجھ سے کچھ کہا نہ سُنا، گھر سے چل دیئے اور ایک گلی میں چھپ کر بھیّا کو دیکھتے رہے۔ جب بھیا نے اُنھیں دیکھ لیا تو بھاگے۔ تمہارے پاس آتے ہوئے لجاتے ہیں۔

میں نے کہا۔ ہاں، ہاں، میں نے اس دن تم سے جو کہا تھا، اماں جی -

ماں۔ گھر میں کچھ کھانے پینے کو ہے ؟

عورت - ہاں بہو جی، تمہارے آسرباد سے کھانے پینے کا دُکھ نہیں ہے۔ آج سویرے اُٹھے اور تالاب کی طرف چلے گئے۔ بہت کہتی رہی کہ باہر مت جاؤ۔ ہوا لگ جائے گی۔ مگر نہ مانے۔ مارے کمجوری کے پیر کانپنے لگتے ہیں۔ مگر تالاب میں گھس کر یہ کمل گٹے توڑ لائے اور مجھ سے کہا کہ لے جا۔ بھیا کو دے آ۔ انھیں کمل گٹے بہت اچھے لگتے ہیں۔ کُسل چھیم (خیر و عافیت) پوچھتی آنا۔

میں نے پوٹلی سے کمل گٹے نکال لئے اور مزے سے کھا رہا تھا۔ ماں نے بہت آنکھیں دکھائیں مگر یہاں اتنا صبر کہاں ؟

میں نے کہا۔ کہہ دینا سب کُسل ہے۔ میں نے کہا یہ بھی کہہ دینا کہ بھیا نے بلایا ہے۔

نہ جاؤ گے تو پھر تم سے کبھی نہ بولیں گے۔ ہاں —

بابو جی کھانا کھا کر نکل آئے تھے۔ تولئے سے ہاتھ منہ صاف کرتے ہوئے بولے۔ اور یہ بھی کہہ دینا کہ صاحب نے تم کو بحال کر دیا ہے۔ جلد جاؤ ورنہ کوئی دوسرا آدمی رکھ لیا جاوے گا۔

عورت نے اپنا کپڑا اُٹھایا اور چلی گئی۔ ماں نے بہت پکارا مگر وہ نہ رُکی۔ شاید اماں جی اُسے آٹا دال وغیرہ دینا چاہتی تھیں۔

ماں نے پوچھا۔ سچ مچ بحال ہو گیا؟

بابو جی۔ اور کیا جھوٹ ہی بلا رہا ہوں۔ میں نے تو پانچویں ہی روز اُس کی بحال رپورٹ کی تھی۔

ماں۔ یہ تم نے بہت اچھا کیا۔

بابو جی۔ اُس کی بیماری کی یہی دوا ہے۔

(۴)

علی الصباح میں اُٹھا تو کیا دیکھتا ہوں کہ قزاقی لاٹھی ٹیکتا ہوا چلا آ رہا ہے۔ وہ بہت دُبلا ہو گیا تھا۔ معلوم ہوتا تھا بوڑھا ہو گیا ہے۔ ہرا بھرا درخت سوکھ کر ٹھنٹھ ہو گیا تھا۔ میں اُس کی طرف دوڑا اور اُس کی کمر سے لپٹ گیا۔ قزاقی نے میرے گالوں کو چُوما اور مجھے اُٹھا کر کندھے پر بٹھانے کی کوشش کرنے لگا مگر نہ اُٹھ سکا۔ تب وہ چوپایوں کی طرح زمین پر ہاتھوں اور گھٹنوں پر کھڑا ہو گیا اور میں اُس کی پیٹھ پر سوار ہو کر ڈاک خانے کی طرف چلا۔ میں اُس وقت خوشی سے پھولا نہ سماتا تھا اور شاید قزاقی مجھ سے بھی زیادہ خوش تھا۔

بابو جی نے کہا۔ قزاقی تم بحال ہو گئے، اب کبھی دیر نہ کرنا۔

قزاقی روتا ہوا والد صاحب کے قدموں پر گر پڑا۔ مگر شاید میرے نصیب میں دو سکھ بھوگنا بدا نہ تھا۔ منو ملا تو قزاقی چھوٹا۔ قزاقی آیا تو منو ہاتھ سے گیا اور ایسا گیا کہ اُس کے جانے کا رنج آج تک ہے۔ منو میری ہی تھالی میں کھاتا تھا۔ جب تک میں کھانے نہ بیٹھوں وہ بھی کچھ نہ کھاتا تھا۔ اُسے بھات سے بہت ہی رغبت تھی۔ مگر جب تک خوب گھی نہ پڑا ہو اس کا جی نہ بھرتا تھا۔ وہ میرے ہی ساتھ سوتا تھا اور میرے ساتھ ہی اُٹھتا بھی۔ صفائی تو اُسے اس قدر پسند تھی کہ رفع حاجت کے لئے گھر سے باہر میدان میں نکل جاتا تھا۔ کتوں سے اس کو چڑ تھی۔ کتوں کو گھر میں نہ گھسنے دیتا تھا۔ کتے کو دیکھتے ہی تھالی سے اُٹھ جاتا اور اُسے دوڑا کر گھر سے باہر نکال دیتا تھا۔

قزاقی کو ڈاک خانے میں چھوڑ کر جب میں کھانا کھانے گیا تو منو بھی آ بیٹھا ابھی دو چار ہی لقمے کھائے تھے کہ ایک بڑا سا جھبرا کتا صحن میں نظر آیا۔ منو اُسے دیکھتے ہی دوڑا۔ دوسرے مکان میں جا کر کتا چوہا ہو جاتا ہے۔ جھبرا کتا اُسے آتا دیکھ کر بھاگا۔ منو کو اب لوٹ آنا چاہیئے تھا مگر وہ کتا اُس کے لئے ملک الموت تھا۔ منو کو اُسے گھر سے نکال کر بھی صبر نہ ہوا۔ وہ اُسے گھر سے باہر میدان میں بھی دوڑانے لگا۔ منو کو شاید خیال نہ رہا کہ یہاں اُس کی عملداری نہیں ہے۔ وہ اس احاطہ میں پہنچ گیا تھا جہاں جھبرے کا بھی اتنا ہی اقتدار تھا جتنا منو کا اپنے گھر میں۔ منو کتوں کو بھگاتے بھگاتے شاید اپنے قوتِ بازو پر گھمنڈ کرنے لگا تھا۔ وہ یہ نہ سمجھتا تھا کہ مکان میں اُس کی حمایت میں مالکِ مکان کا خوف کام کیا کرتا ہے۔ جھبرے

نے اس میدان میں آتے ہی منّو کی گردن دبا دی۔ بیچارے منّو کے منہ سے آواز تک نہ نکلی۔ جب پڑوسیوں نے شور مچایا تو میں دوڑا۔ دیکھا تو منّو مرا پڑا ہے اور جھبرے کا کہیں پتہ نہیں ؛

[پریم چالیسی]

عیدگاہ

رمضان کے پُورے تیس روزوں کے بعد آج عید آئی ہے۔ کتنی سُہانی اور رنگین صبح ہے۔ بچہ کی طرح پُر تبسم، درختوں پر کچھ عجیب ہریاول ہے۔ کھیتوں میں کچھ عجیب رونق ہے۔ آسمان پر کچھ عجیب فضا ہے۔ آج کا آفتاب دیکھو کتنا پیارا ہے، گویا دنیا کو عید کی خوشی پر مبارکباد دے رہا ہے۔ گاؤں میں کتنی چہل پہل ہے۔ عیدگاہ جانے کی دھوم ہے۔ کسی کے کُرتے میں بٹن نہیں ہیں۔ سوئی تاگا لینے دوڑا جا رہا ہے کسی کے جوتے سخت ہو گئے ہیں انہیں تیل اور پانی سے نرم کر رہا ہے۔ جلدی جلدی بیلوں کو سانی پانی دے دیں۔ عیدگاہ سے لوٹتے لوٹتے دوپہر ہو جائے گی۔ تیس کوس کا پیدل راستہ پھر سینکڑوں رشتے قرابت والوں سے ملنا ملانا۔ دوپہر سے پہلے لوٹنا غیر ممکن ہے۔ لڑکے سب سے زیادہ خوش ہیں۔ کسی نے ایک روزہ رکھا وہ بھی دوپہر تک۔ کسی نے وہ بھی نہیں۔ لیکن عیدگاہ جانے کی خوشی اُن کا حصّہ ہے۔ روزے

بڑے بوڑھوں کے لئے ہوں گے۔ بچوں کے لئے تو عید ہے۔ روز عید کا نام رٹتے تھے۔ آج وہ آگئی۔ اب جلدی پڑی ہوئی ہے کہ عیدگاہ کیوں نہیں چلتے۔ انھیں گھر کی فکروں سے کیا واسطہ۔ سیویوں کے لئے گھر میں دودھ اور شکر مینوے ہیں یا نہیں۔ اس کی انھیں کیا فکر۔ وہ کیا جانیں ابا جان کیوں بدحواس گاؤں کے مہاجن چودھری قاسم علی کے گھر دوڑے جا رہے ہیں۔ ان کی اپنی جیب میں قارون کا خزانہ رکھا ہوا ہے۔ بار بار جیب سے اپنا خزانہ نکال کر گنتے ہیں۔ دوستوں کو دکھاتے ہیں اور خوش ہو کر رکھ لیتے ہیں۔ انہیں دو چار پیسوں میں دنیا کی ساری نعمتیں لائیں گے کھلونے اور مٹھائیاں اور خدا جانے کیا کیا۔ اور سب سے زیادہ خوش ہے حامد۔ وہ چار سال کا غریب صورت بچہ ہے۔ جس کا باپ پچھلے سال ہیضہ کی نذر ہو گیا اور ماں نہ جانے کیوں زرد ہوتے ہوتے مر گئی۔ کسی کو پتہ نہ چلا کیا بیماری ہے۔ کہتی کس سے کون سُننے والا تھا۔ دل پر جو گزرتی سہتی تھی۔ اور جب نہ سہا گیا دنیا سے رخصت ہو گئی۔ اب حامد اپنی بوڑھی دادی امینہ کی گود میں سوتا ہے اور اتنا ہی خوش ہے۔ اس کے ابّا جان بڑی دُور روپے کمانے گئے ہیں۔ بہت سی تھیلیاں لے کر آئیں گے۔

امی جان اللہ میاں کے گھر مٹھائی لینے گئی ہیں، اس لئے خاموش ہے۔

حامد کے پاؤں میں جوتے نہیں ہیں۔ سر پر ایک پرانی دھرانی ٹوپی ہے جس کا گوٹا سیاہ ہو گیا ہے۔ پھر بھی وہ خوش ہے۔ جب اس کے ابّا جان تھیلیاں اور اماں جان نعمتیں لے کر آئیں گی تب وہ دل کے ارمان نکالے گا۔ تب دیکھے گا۔ محمود اور محسن اور سمیع کہاں سے اتنے پیسے لاتے ہیں۔ دنیا اپنی مصیبتوں کی ساری لے کر

آئے اس کی ایک نگاہِ معصوم اسے پامال کرنے کے لئے کافی ہے۔"

حامد اندر جاکر امینہ سے کہتا ہے تم ڈرنا نہیں، اماں میں گاؤں والوں کا ساتھ نہ چھوڑوں گا۔ بالکل نہ ڈرنا۔ لیکن امینہ کا دل نہیں مانتا۔ گاؤں کے بچے اپنے اپنے باپ کے ساتھ جارہے ہیں۔ حامد کیا اکیلا ہی جائے گا۔ اس بھیڑ بھاڑ میں کہیں کھو جائے تو کیا ہو۔ نہیں امینہ اسے تنہا نہ جانے دے گی۔ ننھی سی جان۔ تین کوس چلے گا، پاؤں میں چھالے نہ پڑ جائیں گے۔

مگر وہ چلی جائے تو یہاں سوئیاں کون پکائے گا۔ بھوکا پیاسا دوپہر کو لوٹے گا کیا اس وقت سوئیاں پکانے بیٹھے گی۔ رونا تو یہ ہے کہ امینہ کے پاس پیسے نہیں ہیں۔ اس نے فہیمن کے کپڑے سئے تھے۔ آٹھ آنے پیسے ملے تھے۔ اسی اٹھنی کو ایمان کی طرح بچاتی چلی آتی ہے۔ اِس عید کے لئے لیکن کل گھر میں کچھ نہ تھا اور گوالن کے پیسے چڑھ گئے تھے، دینے پڑے۔ حامد کے لئے دو پیسے کا روز دودھ تو لینا پڑتا ہے۔ اب کل دو آنے پیسے بچ رہے ہیں۔ تین پیسے حامد کی جیب میں اور پانچ پیسے امینہ کے بٹوے میں۔ یہی بساط ہے، اللہ ہی بیڑا پار کرے۔ دھوبن، مہترانی اور نائن سب ہی تو آئیں گے۔ سب ہی کو سوئیاں چاہئیں۔ کس کس سے منہ چھپائے؟ سال بھر کا تہوار ہے، زندگی خیریت سے رہے۔ ان کی تقدیر بھی تو اس کے ساتھ ہے۔ بچے کو خدا سلامت رکھے یہ دن بھی یوں کٹ جائیں گے۔

گاؤں سے لوگ چلے اور بچوں کے ساتھ حامد بھی تھا۔ سب کے سب دوڑ کر آگے نکل جاتے۔ پھر کسی درخت کے نیچے کھڑے ہو کر ساتھ والوں کا انتظار کرتے۔ یہ لوگ کیوں اتنے آہستہ آہستہ چل رہے ہیں۔

شہر کا سواد شروع ہوگیا۔ سڑک کے دونوں طرف امیروں کے پختہ باغ ہیں۔ پختہ چہار دیواری بنی ہوئی ہے۔ درختوں میں آم لگے ہوئے ہیں۔ حامد نے ایک کنکری اُٹھا کر ایک آم پر نشانہ لگایا۔ مالی اندر سے گالی دیتا ہوا باہر آیا۔ بچے وہاں سے ایک فرلانگ پر ہیں۔ خوب ہنس رہے ہیں۔ مالی کو کیسا اُلّو بنایا۔

بڑی بڑی عمارتیں آنے لگیں۔ یہ عدالت ہے، یہ مدرسہ ہے، یہ کلب گھر ہے۔ اتنے بڑے مدرسہ میں کتنے سارے لڑکے پڑھتے ہوں گے۔ لڑکے نہیں ہیں جی بڑے بڑے آدمی ہیں۔ سچ ان کی بڑی بڑی مونچھیں ہیں۔ اتنے بڑے ہو گئے ابھی تک پڑھے جاتے ہیں۔ آج تو چھٹی ہے۔ لیکن ایک بار جب پہلے آئے تھے تو بہت سے داڑھی مونچھوں والے یہاں کھیل رہے تھے۔ نہ جانے کب تک پڑھیں گے اور کیا کریں گے اتنا پڑھ کر۔

گاؤں کے دیہاتی مدرسے میں دو تین بڑے بڑے لڑکے ہیں۔ بالکل کودن، غبی کام سے جی چُراتے ہیں۔ یہ لڑکے بھی اسی طرح کے ہوں گے جی اور کیا نہیں۔ کیا اب تک پڑھتے ہوتے۔ وہ کلب گھر ہے وہاں جادو کا کھیل ہوتا ہے۔ سُنا ہے مُردوں کی کھوپڑیاں اڑتی ہیں۔ آدمی کو بے ہوش کر دیتے ہیں۔ پھر اس سے جو کچھ پوچھتے ہیں وہ سب کچھ بتلا دیتا ہے۔ اور بڑے بڑے تماشے ہوتے ہیں اور میمیں بھی کھیلتی ہیں سچ۔ ہماری اماں کو وہ دے دو، کیا کہلاتا ہے "بیٹ" تو اُسے گھماتے ہی لڑھک جائیں۔

محسن نے کہا "ہماری امّی جان تو اُسے پکڑ ہی نہ سکیں، ہاتھ کانپنے لگے۔ اللہ قسم!"

حامد نے اس سے اختلاف کیا۔ "چلو منوں آٹا پیس ڈالتی ہیں ذرا سی بیٹ پکڑ لیں گی تو ہاتھ کانپنے لگیں۔ سینکڑوں گھڑے پانی روز نکالتی ہیں۔ کسی میم کو ایک گھڑا پانی نکالنا پڑے تو آنکھوں تلے اندھیرا آ جائے۔

محسن۔ "لیکن دوڑتی تو نہیں۔ اُچھل کود نہیں سکتیں"۔

حامد۔ "کام آپڑتا ہے تو دوڑ بھی لیتی ہیں۔ ابھی اُس دن تمہاری گائے کھُل گئی تھی اور چودھری کے کھیت میں جا پڑی تھی تو تمہاری اماں ہی تو دوڑ کر اُسے بھگا لائی تھیں۔ کتنی تیزی سے دوڑتی تھیں۔ ہم تم دونوں اُن سے پیچھے رہ گئے۔"

پھر آگے چلو حلوائیوں کی دکانیں شروع ہوئیں۔ آج خوب سجی ہوئی تھیں۔ اتنی مٹھائی کون کھاتا ہے؟ دیکھو نا ایک ایک دکان پر منوں ہوں گی۔ سُنا ہے رات کو ایک جن ہر ایک دکان پر جاتا ہے اور جتنا مال بچا ہوتا ہے وہ سب خود خرید لیتا ہے اور سچ مچ کے روپے دیتا ہے۔ بالکل ایسے ہی چاندی کے روپے۔

محمود کو یقین نہ آیا۔ "ایسے روپے جنات کو کہاں سے مل جائیں گے؟"

محسن۔ جنات کو روپوں کی کیا کمی جس خزانے میں چاہیں چلے جائیں، کوئی انھیں دیکھ نہیں سکتا۔ لوہے کے دروازے تک نہیں روک سکتے۔ جناب، آپ ہیں کس خیال میں۔ ہیرے جواہرات ان کے پاس رہتے ہیں۔ جس سے خوش ہو گئے اُسے ٹوکروں جواہرات دے دیئے۔ پانچ منٹ میں کہو کابل پہنچ جائیں"۔

حامد۔ "جناب بہت بڑے ہوتے ہوں گے"

محسن۔ "اور کیا۔ ایک ایک آسمان کے برابر ہوتا ہے۔ زمین پر کھڑا ہو جائے تو اُس کا سر آسمان سے جا لگے۔ مگر چاہے تو ایک لوٹے میں گھُس جائے"۔

سمیع "سُنا ہے چودھری صاحب کے قبضے میں بہت سے جنات ہیں۔ کوئی چیز چوری چلی جائے چودھری صاحب اُس کا پتہ بتادیں گے اور چور کا نام تک بتادیں گے۔ جمعراتی کا بچھڑا اس دن کھو گیا تھا، تین دن حیران ہوئے کہیں نہ ملا۔ تب جھک مار کر چودھری کے پاس گئے۔ چودھری نے کہا مویشی خانے میں ہے، اور وہیں ملا۔ جنات آکر انھیں سب خبر دے جایا کرتے ہیں۔"

اب ہر ایک کی سمجھ میں آگیا کہ چودھری قاسم علی کے پاس کیوں اتنی دولت ہے۔ اور کیوں وہ قرب وجوار کے مہاجن ہیں۔ جنات آکر اُنھیں روپے دے جاتے ہیں۔ آگے چلیئے۔ یہ پولیس لائن ہے۔ یہاں پولیس والے قواعد کرتے ہیں۔ رائٹ، لپ، پھام پھُو!

نوری نے تصحیح کی۔ "یہاں پولیس والے پہرہ دیتے ہیں"

"جب ہی تمہیں بہت خبر ہے۔" "اجی حضرت یہ لوگ چوریاں کراتے ہیں۔ شہر کے جتنے چور ڈاکو ہیں سب ان سے ملے رہتے ہیں۔ رات کو یہ سب ایک محلہ میں چوروں سے کہتے ہیں چوری کرو۔ اور دوسرے محلے میں کہتے ہیں جاگتے رہو۔ میرے ماموں ایک تھانہ میں سپاہی ہیں۔ بیس روپے مہینہ پاتے ہیں لیکن تھیلیاں بھر بھر گھر بھیجتے ہیں۔ اللہ قسم تھیلیاں بھر بھر"۔ میں نے ایک بار پوچھا تھا ماموں اتنے روپے کہاں سے لاتے ہو۔ ہنس کر کہنے لگے۔ بیٹا اللہ دیتا ہے۔ خود ہی بعد کو کہا کہ ہم لوگ چاہیں تو ایک دن میں لاکھ مار لائیں۔ ہم تو اتنے ہی لیتے ہیں جس میں اپنی بدنامی نہ ہو۔ اور نوکری بنی رہے۔

حامد نے تعجب سے پوچھا۔ "یہ لوگ چوری کرواتے ہیں تو کوئی انہیں پکڑتا نہیں"

نوری نے اس کی کوتاہ فہمی پر رحم کھاکر کہا۔ "ارے احمق انھیں کون پکڑے گا پکڑنے والے تو یہ خود ہیں۔ لیکن اللہ انھیں سزا بھی خوب دیتا ہے۔ تھوڑے دن ہوئے ماموں کے گھر میں آگ لگ گئی تھی۔ سارا مال متاع جل گیا۔ ایک برتن تک نہ بچا۔ کئی دن تک درخت کے نیچے سوئے اللہ قسم۔! پھر نہ جانے کہاں سے قرض لائے تو برتن بھانڈے آئے۔"

بستی گھنی ہونے لگی۔ عیدگاہ جانے والوں کے مجمعے نظر آنے لگے۔ ایک سے ایک زرق برق پوشاک پہنے ہوئے۔ کوئی تانگے پر سوار کوئی موٹر پر، چلتے تھے تو کپڑوں سے عطر کی خوشبو اڑتی تھی۔

دہقانوں کی یہ مختصر سی ٹولی اپنی بے سروسامانی سے بے حس، اپنی خستہ حالی میں مگن، صابر و شاکر چلی جارہی تھی۔ جس چیز کی طرف تاکتے، تاکتے ہی رہ جاتے اور پیچھے سے بارہا ہارن کی آواز ہونے پر بھی خبر نہ ہوتی۔ محسن تو موٹر کے نیچے جاتے جاتے بچا۔

وہ عیدگاہ نظر آئی۔ جماعت شروع ہوگئی ہے۔ اوپر املی کے گھنے درختوں کا سایہ ہے۔ نیچے کھلا ہوا پختہ فرش ہے۔ جس پر جاجم بچھا ہوا ہے اور نمازیوں کی قطاریں ایک کے پیچھے دوسری، خدا جانے کہاں تک چلی گئی ہیں۔ پختہ فرش کے نیچے جاجم بھی نہیں۔ کئی قطاریں کھڑی ہیں جو آتے جاتے ہیں پیچھے کھڑے ہوتے جاتے ہیں۔ آگے اب جگہ نہیں رہی۔ یہاں کوئی رتبہ اور عہدہ نہیں دیکھتا۔ اسلام کی نگاہ میں سب انسان برابر ہیں۔ دہقانوں نے بھی وضو کیا اور جماعت میں شامل ہوگئے۔ کتنی باقاعدہ منظم جماعت ہے۔ لاکھوں آدمی ایک ساتھ جھکتے ہیں۔ ایک

ساتھ دوزانو بیٹھ جاتے ہیں اور یہ عمل بار بار ہوتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے گویا بجلی کی لاکھوں بتیاں ایک ساتھ روشن ہو جائیں گی اور ایک ساتھ بجھ جائیں گی۔ کتنا پُر احترام رعب انگیز نظارہ ہے۔ جس کی ہم آہنگی اور وسعت اور تعداد دلوں پر ایک وجدانی کیفیت پیدا کر دیتی ہے۔ گویا اخوت کا ایک رشتہ ان تمام روحوں کو منسلک کئے ہوئے ہے۔

(۲)

نماز ختم ہو گئی۔ لوگ باہم گلے مل رہے ہیں۔ کچھ لوگ محتاجوں اور سائلوں کو خیرات کر رہے ہیں۔ جو آج یہاں ہزاروں جمع ہو گئے ہیں۔ ہمارے دہقانوں نے مٹھائی اور کھلونے کی دکانوں پر یورش کی۔ بوڑھے ان دلچسپیوں میں بچوں سے کم محظوظ نہیں ہیں۔ یہ دیکھو ہنڈولا ہے۔ ایک پیسہ دے کر آسمان پر جاتے معلوم ہو گے، کبھی زمین پر گرتے۔ یہ چرخی ہے، لکڑی کے گھوڑے، اونٹ، ہاتھی، میخوں سے لٹکے ہوئے ہیں۔ ایک پیسہ دے کر بیٹھ جاؤ اور پچیس چکروں کا مزہ لو۔ محمود اور محسن ہنڈولے پر بیٹھے ہیں۔ نورا اور سمیع گھوڑوں پر۔ اُن کے بزرگ اتنے ہی طفلانہ اشتیاق سے چرخی پر بیٹھے ہیں۔ حامد دور کھڑا ہے۔ تین ہی پیسے تو اس کے پاس ہیں۔ ذرا سا چکر کھانے کے لئے وہ اپنے خزانہ کا ثلث نہیں صرف کر سکتا۔ محسن کا باپ اسے بار بار چرخی پر بلاتا ہے لیکن وہ راضی نہیں ہوتا۔ بوڑھے کہتے ہیں اس لڑکے میں ابھی سے اپنا پرایا آگیا۔ حامد سوچتا ہے کیوں کسی کا احسان لوں۔ عسرت نے اُسے ضرورت سے زیادہ ذکی الحس بنا دیا ہے۔

سب لوگ چرخی سے اُترتے ہیں۔ کھلونوں کی خرید شروع ہوتی ہے۔ سپاہی

اور گجر یا اور راجہ رانی اور وکیل اور دھوبی اور بھشتی بے امتیاز ران سے ران ملائے بیٹھے ہیں - دھوبی راجہ رانی کی بغل میں ہے اور بھشتی وکیل صاحب کی بغل میں - واہ کتنے خوبصورت ، بولا ہی چاہتے ہیں - محمود سپاہی پر لٹو ہو جاتا ہے - خاکی وردی اور لال پگڑی ، کندھے پر بندوق ، معلوم ہوتا ہے ابھی قواعد کے لئے چلا آرہا ہے - محسن کو بھشتی پسند آیا - کمر جھکی ہوئی ہے - اس پر مشک کا دہانہ ایک سے پکڑے ہوئے ہے - دوسرے ہاتھ میں رسی ہے - کتنا لبشاش چہرہ ہے - شاید کوئی گیت گا رہا ہے - مشک سے پانی ٹپکتا ہوا معلوم ہوتا ہے - نوری کو وکیل سے مناسبت ہے - کتنی عالمانہ صورت ہے - سیاہ چغہ ، نیچے سفید اچکن ، اچکن کے سینہ کی جیب میں سنہری زنجیر - ایک ہاتھ میں قانون کی کتاب لئے ہوئے ہے : معلوم ہوتا ہے ابھی کسی عدالت سے جرح یا بحث کر کے چلے آرہے ہیں - یہ سب دو دو پیسے کے کھلونے ہیں - حامد کے پاس کُل تین پیسے ہیں - اگر دو کا ایک کھلونا لے لے تو پھر اور کیا لے گا - نہیں کھلونے فضول ہیں - کہیں ہاتھ سے گر پڑے تو چُور چُور ہو جائے - ذرا سا پانی پڑ جائے تو سارا رنگ دُھل جائے - ان کھلونوں کو لے کر وہ کیا کرے گا - کس مصرف کے ہیں !

محسن کہتا ہے " میرا بھشتی روز پانی دے جائے گا - صبح و شام "

محمود - " اور میرا سپاہی گھر کا پہرہ دے گا - کوئی چور آئے گا تو فوراً بندوق سے فیر کر دے گا "

نوری - " اور میرا وکیل روز مقدمے لڑائے گا اور روز روپے لائے گا "

حامد کھلونوں کی مذمت کرتا ہے - مٹی ہی کے تو ہیں ، گریں تو چکنا چور ہو جائیں

لیکن ہر چیز کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھ رہا ہے اور چاہتا ہے ذرا دیر کے لئے انہیں ہاتھ میں لے سکتا۔ یہ بساطی کی دکان ہے۔ طرح طرح کی ضروری چیزیں، ایک چادر پر بچھی ہوئی ہیں۔ گیند اور سیٹیاں اور بگل اور بھونرے اور ربڑ کے کھلونے اور ہزاروں چیزیں۔ محسن ایک سیٹی لیتا ہے۔ محمود گیند۔ نوری ربڑ کا بطخ جو چوں چوں کرتا ہے۔ اور سمیع ایک خنجری۔ اُسے بجا بجا کر وہ گائے گا۔ حامد کھڑا ہر ایک کو حسرت سے دیکھ رہا ہے۔ جب اس کے رفیق کوئی چیز خرید لیتے ہیں۔ تو وہ بڑے اشتیاق سے ایک بار اُسے ہاتھ میں لے کر دیکھنے کے لئے لپکتا ہے۔ لیکن لڑکے اتنے دوست نواز نہیں ہوتے۔ خاص کر جب ابھی دلچسپی تازہ ہے۔ بچارہ یوں مایوس ہو کر رہ جاتا ہے۔

کھلونوں کے بعد مٹھائیوں کا نمبر آیا۔ کسی نے ریوڑیاں لی ہیں، کسی نے گلاب جامن، کسی نے سوہن حلوا۔ مزے سے کھا رہے ہیں۔ حامد ان کی برادری سے خارج ہے۔ کمبخت کی جیب میں تین پیسے تو ہیں۔ کیوں نہیں کچھ لے کر کھاتا حریص نگاہوں سے سب کی طرف دیکھتا ہے۔

محسن نے کہا "حامد یہ ریوڑی لے جا کتنی خوشبودار ہے"۔

حامد سمجھ گیا یہ محض شرارت ہے۔ محسن اتنا فیاض طبع نہ تھا۔ پھر بھی وہ اُس کے پاس گیا۔ محسن نے دُور سے دو تین ریوڑیاں نکالیں۔ حامد کی طرف بڑھائیں۔ حامد نے ہاتھ پھیلایا محسن نے ہاتھ کھینچ لیا اور ریوڑیاں اپنے منہ میں رکھ لیں۔ محمود اور نور اور سمیع خوب تالیاں بجا بجا کر ہنسنے لگے۔ حامد کھسیانا ہو گیا۔

محسن نے کہا۔ "اچھا اب کی ضرور دیں گے۔ یہ لیجاؤ حامد اللہ قسم!"

حامد نے کہا "رکھئے رکھئے کیا میرے پاس پیسے نہیں ہیں۔"

سمیع۔ "تین ہی پیسے تو ہیں کیا لوگے؟"

محمود۔ "تم اس سے مت بولو۔ حامد میرے پاس آؤ یہ گلاب جامن لے لو۔"

حامد۔ "مٹھائی کون بڑی نعمت ہے۔ کتاب میں اس کی برائیاں لکھی ہیں۔"

محسن۔ "لیکن جی میں کہہ رہے ہوگے کہ کچھ مل جائے تو کھالیں۔ اپنے پیسے کیوں نہیں نکالتے۔"

محمود۔ "میں اس کی ہوشیاری سمجھتا ہوں۔ جب ہمارے سارے پیسے خرچ ہوجائینگے تب یہ مٹھائی لے گا اور ہمیں چڑا چڑا کر کھائے گا۔"

حلوائیوں کی دکانوں کے آگے کچھ دکانیں لوہے کی چیزوں کی تھیں۔ کچھ گلٹ اور ملمع کے زیورات کی۔ لڑکوں کے لئے یہاں دلچسپی کا کوئی سامان نہ تھا۔ حامد لوہے کی دکان پر ایک لمحے کے لئے رک گیا۔ دست پناہ رکھے ہوئے تھے۔ وہ دست پناہ خریدے گا، ماں کے پاس دست پناہ نہیں ہے۔ توے سے روٹیاں اُتارتی ہے تو ہاتھ جل جاتا ہے۔ اگر وہ دست پناہ لے جاکر اماں کو دے دے تو وہ کس قدر خوش ہوں گی۔ پھر ان کی انگلیاں کبھی نہ جلیں گی۔ گھر میں ایک کام کی چیز ہوجائے گی۔ کھلونوں سے کیا فائدہ محنت کے پیسے خراب ہوتے ہیں ذرا دیر ہی تو خوشی ہوتی ہے پھر تو انھیں کوئی آنکھ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھتا۔ یا تو گھر پہنچتے پہنچتے ٹوٹ پھوٹ برابر ہوجائیں گے یا چھوٹے بچے جو عیدگاہ نہیں جاسکے ہیں ضد کرکے لے لیں گے۔ اور توڑ ڈالیں گے۔ دست پناہ کتنے فائدے کی چیز ہے۔ روٹیاں توے سے اُتار لو۔ چولھے سے آگ نکال کر دے دو۔ اماں کو کہاں فرصت ہے بازار آئیں اور اتنے پیسے

کہاں ملتے ہیں۔ روز ہاتھ جلاتی ہیں۔ اس کے ساتھی آگے بڑھ گئے ہیں۔ سبیل پر سب کے سب پانی پی رہے ہیں۔ کتنے لالچی ہیں۔ سب نے اتنی مٹھائیاں لیں کسی نے مجھے ایک بھی نہ دی۔ اس پر کہتے ہیں میرے ساتھ کھیلو۔ میری تختی دھلاؤ۔ اب اگر میاں محسن نے کوئی کام کرنے کو کہا تو خبر لوں گا۔ کھائیں مٹھائیاں۔ آپ منہ سڑے گا پھوڑے پھنسیاں نکلیں گی۔ آپ ہی چٹوری زبان ہو جائے گی۔ تب پیسے چرائیں گے اور مار کھائیں گے۔ میری زبان کیوں خراب ہو گی۔ اُس نے پھر سوچا۔ اماں دست پناہ دیکھتے ہی دوڑ کر میرے ہاتھ سے لے لیں گی اور کہیں گی میرا بیٹا اپنی اماں کے لئے دست پناہ لایا ہے۔ ہزاروں دعائیں دیں گی۔ پھر اسے پڑوسیوں کو دکھائیں گی۔ سارے گاؤں میں واہ واہ مچ جائے گی۔ ان لوگوں کے کھلونوں پہ کون انھیں دعائیں دے گا۔ بزرگوں کی دعائیں سیدھی خدا کی درگاہ میں پہنچتی ہیں اور فوراً قبول ہوتی ہیں۔ میرے پاس بہت سے پیسے نہیں ہیں۔ جب ہی تو محسن اور محمود یوں مزاج دکھاتے ہیں۔ میں بھی ان کو مزاج دکھاؤں گا۔ وہ کھلونے کھیلیں، مٹھائیں کھائیں۔ میں غریب سہی کسی سے کچھ مانگنے تو نہیں جاتا۔ آخر ابا کبھی نہ کبھی آئیں گے ہی۔ پھر ان لوگوں سے پوچھوں گا کتنے کھلونے لوگے۔ ایک ایک کو ایک ایک ٹوکروں دوں اور دکھادوں کہ دوستوں کے ساتھ اس طرح سلوک کیا جاتا ہے۔ جتنے غریب لڑکے ہیں سب کو اچھے اچھے کرتے دلوادوں گا اور کتابیں دے دوں گا۔ یہ نہیں کہ ایک پیسے کی ریوڑیاں لیں تو چڑا چڑا کر کھانے لگے۔ دست پناہ دیکھ کر سب کے سب ہنسیں گے۔ احمق تو ہیں ہی سب۔ اس نے دکاندار سے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔ "یہ دست پناہ بیچو گے"۔ دکاندار نے اس کی طرف دیکھا اور ساتھ کوئی آدمی نہ دیکھ کر کہا۔ "وہ تمہارے کام کا نہیں ہے۔"

"بکاؤ ہے یا نہیں"

"بکاؤ ہے جی۔ اور یہاں کیوں لاد کر لائے ہیں"

"تو بتلاتے کیوں نہیں، کے پیسے کا دو گے؟"

"چھ پیسے لگیں گے"

حامد کا دل بیٹھ گیا۔ کلیجہ مضبوط کر کے بولا۔

"تین پیسے لو گے؟" اور آگے بڑھا کہ دکاندار کی گھرکیاں نہ سُنے۔ مگر دکاندار نے گھرکیاں نہ دیں، دست پناہ اس کی طرف بڑھا دیا اور پیسے لے لئے"

حامد نے دست پناہ کندھے پر رکھ لیا گویا بندوق ہے اور شان سے اکڑتا ہوا اپنے رفیقوں کے پاس آیا۔

محسن نے ہنستے ہوئے کہا "یہ دست پناہ لایا ہے۔ احمق اسے کیا کرے گا؟"

حامد نے دست پناہ زمین پر پٹک کر کہا "ذرا اپنا بہشتی زمین پر گرا دو۔ ساری پسلیاں چور چور ہو جائیں گی بچا کی۔"

محمود۔ تو یہ دست پناہ کوئی کھلونا ہے؟"

حامد۔ کھلونا کیوں نہیں ہے ابھی کندھے پر رکھا بندوق ہو گیا۔ ہاتھ میں لے لیا فقیر کا چمٹا ہو گیا۔ چاہوں تو اس سے تمہاری ناک پکڑ لوں۔ ایک چمٹا دوں تو تم لوگوں کے سارے کھلونوں کی جان نکل جائے۔ تمہارے کھلونے کتنا ہی زور لگائیں اس کا بال بیکا نہیں کر سکتے۔ میرا بہادر شیر ہے یہ دست پناہ!"

سمیع متاثر ہو کر بولا۔ "میری خنجری سے بدلو گے دو آنے کی ہے"

حامد نے خنجری کی طرف حقارت سے دیکھ کر کہا "میرا دست پناہ چاہے تو

تمہاری خنجری کا پیٹ پھاڑ ڈالے۔ بس ایک چمڑے کی جھلی لگادی۔ ڈھب ڈھب بولنے لگی۔ ذرا سا پانی لگے تو ختم ہو جائے۔ میرا بہادر دست پناہ آگ میں، پانی میں آندھی میں طوفان میں برابر ڈٹا کھڑا رہے گا۔

میلہ بہت دور پیچھے چھوٹ چکا تھا۔ دس بج رہے تھے۔ گھر پہنچنے کی جلدی تھی۔ اب دست پناہ نہیں مل سکتا۔ اب کسی کے پاس پیسے بھی تو نہیں رہے۔ حامد ہے بڑا ہوشیار!"

اب دو فریق ہو گئے۔ محمود اور محسن اور نوری ایک طرف، حامد یکہ و تنہا دوسری طرف سمیع غیر جانبدار ہے۔ جس کی فتح دیکھے اس کی طرف جا ملے گا۔ مناظرہ شروع ہو گیا۔ آج حامد کی زبان بڑی صفائی سے چل رہی ہے۔ اتحاد ثلاثہ اس کے جارحانہ عمل سے پریشان ہو رہا ہے۔ ثلاثہ کے پاس تعداد کی طاقت ہے۔ حامد کے پاس حق اور اخلاق۔ ایک طرف مٹی، ربڑ، لکڑی کی چیزیں ہیں، دوسری طرف لوہا۔ جو اس وقت اپنے کو فولاد کہہ رہا ہے۔ وہ روئیں تن ہے۔ صف شکن ہے۔ اگر کہیں شیر کی آواز کان میں آجائے تو میاں بہشتی کے اوسان خطا ہو جائیں۔ میاں سپاہی مٹی کی بندوق چھوڑ کر بھاگیں۔ وکیل صاحب کا سارا قانون پیٹ میں سما جائے۔ چغے میں منہ چھپا کر زمین پر لیٹ جائیں۔ مگر یہ بہادر، رستم ہند لپک کر شیر کی گردن پر سوار ہو جائے گا اور اس کی آنکھیں نکال لے گا۔

محسن نے ایڑی چوٹی کا زور لگا کر کہا: "اچھا تمہارا دست پناہ پانی تو نہیں بھر سکتا؟"

حامد نے دست پناہ سیدھا کر کے کہا: "یہ بہشتی کو ایک ڈانٹ بتائے گا تو دوڑا ہوا پانی لا کر اس کے دروازے پر چھڑکنے لگے گا۔ جناب پھر اس سے چاہے گھڑے، مشکے

کونڈے بھروالو"

محسن کا ناطقہ بند ہوگیا۔ نوری نے بات بنائی "بچا گرفتار ہو جائیں تو عدالت میں بندھے بندھے پھریں گے۔ تب تو ہمارے وکیل صاحب ہی پیروی کریں گے۔ بولئے جناب!

حامد کے پاس اس وار کا دفعیہ اتنا آسان نہ تھا۔ دفعتاً اس نے ذرا مہلت پا جانے کے ارادے سے پوچھا۔" اسے پکڑنے کون آئے گا؟"

محمود نے کہا یہ سپاہی بندوق والا۔!

حامد نے منہ چڑا کر کہا۔ یہ بچارے اس رستم ہند کو پکڑیں گے؟ اچھا لاؤ ابھی ذرا مقابلہ ہو جائے۔ اس کی صورت دیکھتے ہی بچہ کی ماں مر جائے گی۔ پکڑیں گے کیا بچارے"

محسن نے تازہ دم ہو کر وار کیا۔" تمہارے دست پناہ کا منہ روز آگ میں جلے گا"

حامد کے پاس جواب تیار تھا۔" آگ میں بہادر کودتے ہیں جناب تمہارے یہ وکیل اور سپاہی اور بہشتی ڈرپوک ہیں سب گھر میں گھس جائیں گے۔ آگ میں کودنا وہ کام ہے جو رستم ہی کر سکتا ہے۔"

نوری نے انتہائی جودت سے کام لیا۔" تمہارا دست پناہ! باورچی خانے میں زمین پر پڑا رہے گا۔ میرا وکیل شان سے میز کرسی لگا کر بیٹھے گا۔"

اس جملہ نے مردوں میں بھی جان ڈال دی۔ سمیع بھی جیت گیا۔ بے شک بڑے معرکے کی بات کہی"۔ دست پناہ باورچی خانے میں پڑا رہے گا۔"

حامد نے دھاندلی کی۔ میرا دست پناہ باورچی خانہ میں نہیں رہے گا۔ وکیل صاحب

کرسی پر بیٹھیں گے تو جا کر انھیں زمین پر پٹک دے گا اور سارا قانون ان کے پیٹ میں ڈال دے گا۔"

اس جواب میں بالکل جان نہ تھی۔ بالکل بے تکی سی بات تھی۔ لیکن قانون پیٹ میں ڈالنے والی بات چھا گئی۔ ایسی چھا گئی کہ تینوں سورما منہ تکتے رہ گئے۔

حامد نے میدان جیت لیا۔ گوتلاثہ کے پاس ابھی گیند اور سیٹی اور بطِ رزرو میں تھے۔ مگر ان مشین گنوں کے سامنے ان پٹاخوں کو کون پوچھتا۔ دست پناہ رستم ہند ہے اس میں کسی کو چون وچرا کی گنجائش نہیں۔

فاتح کو مفتوحوں سے وقار اور خوشامد کا خراج ملتا ہے۔ وہ حامد کو ملنے لگا۔ اوروں نے تین تین آنے خرچ کئے اور کوئی کام کی چیز نہ لے سکے۔ حامد نے تین ہی پیسوں میں رنگ جما لیا۔ کھلونوں کا کیا اعتبار، دو ایک دن میں ٹوٹ پھوٹ جائیں گے۔ حامد کا دست پناہ تو فاتح رہے گا ہمیشہ۔ صلح کی شرطیں ہونے لگیں۔

محسن نے کہا: "ذرا اپنا چمٹا دو۔ ہم بھی دیکھیں۔ تم چاہو تو ہمارا وکیل دیکھو۔"

حامد کو اس میں کوئی اعتراض نہیں ہے۔ وہ فیاض فاتح ہے۔ دست پناہ باری باری سے محسن، محمود اور سمیع سب کے ہاتھوں میں گیا اور ان کے کھلونے باری باری سے حامد کے ہاتھ میں آئے۔ کتنے خوبصورت کھلونے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے بولا ہی چاہتے ہیں، مگر ان کھلونوں کے لئے انھیں دعا کون دے گا؟ کون کون ان کھلونوں کو دیکھ کر اتنا خوش ہوگا، جتنا اماں جان دست پناہ دیکھ کر ہوں گی۔ اُسے اپنے طرزِ عمل پر مطلق پچھتاوا نہیں ہے۔ پھر اب تو دست پناہ رستم ہے اور سب کھلونوں کا بادشاہ راستے میں محمود نے ایک پیسے کی لکڑی لی اس میں حامد کو بھی خراج ملا۔ حالانکہ وہ

انکار کرتا رہا۔ محسن اور سمیع نے ایک ایک پیسے کے فالسے لئے حامد کو بھی خراج ملا۔ یہ سب رستمِ ہند کی برکت تھی۔

(۳)

گیارہ بجے سارے گاؤں میں چہل پہل ہو گئی۔ میلے والے آ گئے۔ محسن کی چھوٹی بہن نے دوڑ کر بہشتی اس کے ہاتھ سے چھین لیا اور مارے خوشی کے جو اُچھلی تو میاں بہشتی نیچے آ رہے اور عالمِ جاودانی کو سدھارے۔ اس پر بھائی بہن میں مار پیٹ ہوئی۔ دونوں خوب روئے۔ ان کی اماں جان یہ کہرام سن کر بگڑیں اور دونوں کو اوپر سے دو دو چانٹے رسید کئے۔ میاں نوری کے وکیل کا حشر اس سے بھی بدتر ہوا وکیل زمین پر یا طاق پر تو نہیں بیٹھ سکتا۔ اس کی پوزیشن کا لحاظ تو کرنا ہی ہو گا۔ دیوار میں دو کھونٹیاں گاڑی گئیں، اُن پر ایک چیڑ کا پُرانا پٹرا رکھا گیا۔ پٹرے پر سُرخ رنگ کا ایک چیتھڑا بچھا دیا گیا جو بمنزلہ قالین تھا۔ وکیل صاحب عالم بالا پر جلوہ افروز ہوئے۔ یہیں سے قانونی بحث کریں گے۔ نوری ایک پنکھا لے کر جھلنے لگا۔ معلوم نہیں پنکھے کی ہوا سے یا پنکھے کی چوٹ سے وکیل صاحب عالم بالا سے دُنیائے فانی میں آ رہے اور ان کے جسدِ خاکی کے پُرزے ہو گئے۔ پھر بڑے زور شور کا ماتم ہوا۔ اور وکیل صاحب کی میّت پارسی دستور کے مطابق گھورے پر پھینک دی گئی تاکہ بریکار نہ جا کر زاغ و زغن کے کام آ جائے۔

اب رہے میاں محمود کے سپاہی۔ محترم اور ذی رعب ہستی ہے۔ اپنے پیروں چلنے کی ذلّت اُسے گوارا نہیں۔ محمود نے اپنا بکری کا بچہ پکڑا اور اُس پر سپاہی کو سوار کیا۔ محمود کی بہن ایک ہاتھ سے سپاہی کو پکڑے ہوئے تھی اور محمود بکری کے

بچہ کا کان پکڑ کر اسے دروازے پر چلا رہا تھا اور اس کے دونوں بھائی سپاہی کی طرف سے "چھونے والے جاگتے لہو" پکارتے چلتے تھے۔ معلوم نہیں کیا ہوا۔ میاں سپاہی اپنے گھوڑے کی پیٹھ سے گر پڑے اور اپنی بندوق لئے زمین پر آرہے۔ ایک ٹانگ مضروب ہوگئی۔ مگر کوئی مضائقہ نہیں محمود ہوشیار ڈاکٹر ہے۔ ڈاکٹر نگم اور بھاٹیا اس کی شاگردی کر سکتے ہیں۔ اور یہ ٹوٹی ٹانگ کو آناً فاناً میں جوڑ دے گا۔ صرف گولر کا دودھ چاہیئے۔ گولر کا دودھ آتا ہے ٹانگ جوڑی جاتی ہے لیکن جوں ہی کھڑا ہوتا ہے ٹانگ پھر الگ ہو جاتی ہے۔ عمل جراحی ناکام ہو جاتا ہے۔ تب محمود اس کی دوسری ٹانگ بھی توڑ دیتا ہے۔ اب وہ آرام سے ایک جگہ بیٹھ سکتا ہے۔ ایک ٹانگ سے تو نہ چل سکتا تھا نہ بیٹھ سکتا تھا۔ اب وہ گوشے میں بیٹھ کر ٹٹی کی آڑ میں شکار کھیلے گا۔

اب میاں حامد کا قصہ سُنئے۔ امینہ اس کی آواز سنتے ہی دوڑی اور اُسے گود میں اُٹھا کر پیار کرنے لگی۔ دفعتاً اس کے ہاتھ میں چمٹا دیکھ کر وہ چونک پڑی۔

"یہ دست پناہ کہاں تھا بیٹے؟"

"میں نے مول لیا ہے تین پیسے میں"

امینہ نے چھاتی پیٹ لی۔ "یہ کیسا بے سمجھ لڑکا ہے کہ دوپہر ہوگئی نہ کچھ کھایا نہ پیا۔ لایا کیا یہ دست پناہ، سارے میلے میں تجھے کوئی اور چیز ہی نہ ملی۔"

حامد نے خطاوارانہ انداز سے کہا "تمہاری انگلیاں توے سے جل جاتی تھیں کہ نہیں"۔

امینہ کا غصہ فوراً شفقت میں تبدیل ہوگیا اور شفقت بھی وہ جو پُر بیان

ہوتی ہے اور اپنی ساری تاثیر لفظوں میں منتشر کر دیتی ہے۔ یہ بے زبان شفقت تھی۔ درد اور التجا میں ڈوبی ہوئی۔ اُف کتنی نفس کشی ہے۔ کتنی جاں سوزی ہے۔ غریب نے اپنے طفلانہ اشتیاق کو روکنے کے لئے کتنا ضبط کیا ہوگا۔ جب دوسرے لڑکے کھلونے لے رہے ہوں گے۔ مٹھائیاں کھا رہے ہوں گے، اس کا دل کتنا للچاتا ہوگا۔ اتنا ضبط اس سے ہوا کیونکر! اپنی بوڑھی اماں کی یاد اسے وہاں بھی رہی۔ میرا لال۔ میری کتنی فکر رکھتا ہے۔ اس کے دل میں ایک ایسا علوی جذبہ پیدا ہوا کہ اس کے ہاتھ میں دنیا کی بادشاہت آجائے اور وہ اسے حامد کے اوپر نثار کر دے۔

اور تب ایک بڑی دلچسپ بات ہوئی۔ بڑھیا امینہ ننھی سی امینہ بن گئی۔ وہ رونے لگی۔ دامن پھیلا کر حامد کو دعائیں دیتی جاتی تھی اور آنکھوں سے آنسو کی بڑی بڑی بوندیں گراتی جاتی تھی۔ حامد اس کا راز کیا سمجھتا اور نہ شاید ہمارے بعض ناظرین ہی سمجھ سکیں گے۔

(پریم چالیسی)

مجبوری

جب بابو ہردے ناتھ کی اکلوتی لڑکی کیلاش کماری تیرہ سال کی عمر میں بیوہ ہو گئی تو انھوں نے سوچا لڑکی کا دل بہلانے کی کوئی ترکیب کرنی چاہیئے۔ اکیلی رہے گی تو بیٹھی بسورا کرے گی۔ تنہائی رنج کو اور بھی جاں گسل کر دیتی ہے اس لئے ایک گراموفون لائے، قصہ کہانی کی کتابیں جمع کیں اور اپنی بیوی کو تاکید کر دی کہ لڑکی کو سیر تماشے دکھلاتی رہے۔ نہیں ذرا سی بچی رو رو کر مر جائے گی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کیلاش کماری کو سیر و تفریح کا چسکا پڑ گیا۔ ایک دن بھی تھیٹر یا لب دریا کی سیر کرنے نہ جاتی تو اسے دقت کاٹنا عذاب ہو جاتا۔ تفریح، جدت کی غلام ہے اور جدت کو تقویم پارینہ سے نفرت۔ کیلاش کماری نت نئے مشاغل تفریح کی تلاش میں منہمک رہتی۔

زبان خلق بھلا ایسے موقعوں پر کیونکر خاموش رہتی۔ وہ کسی کی رعایت نہیں کرتی کسی نے ذرا ٹوپی ٹیڑھی رکھی اور اس نے آوازے کسے۔ کوئی ذرا اکڑ کر چلا اور پڑوسیوں

کی نظر میں کھُبا۔ بیوہ کے لئے پوجا ہے۔ تیرتھ برت ہے۔ موٹا کھانا ہے، موٹا پہننا ہے، اسے تفریح اور سیر کی کیا ضرورت! لڑکی پیاری سہی لیکن شرم وحیا بھی تو ہے کوئی چیز۔ کچھ دنوں تک تو آپس میں کھچڑی پکتی رہی، آخر ایک دن کئی مستورات نے جاگیشوری کے قدم رنجہ کیا اور کچھ دیر تک ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد ایک صاحبہ بولیں۔ بہن تمہیں مزے میں ہو کہ ہنسی خوشی میں دن کاٹ دیتی ہو، ہمیں تو دن پہاڑ ہو جاتا ہے۔ نہ کوئی کام نہ دھندا۔ کوئی کہاں تک باتیں کرے۔

دوسری خاتون نے فرمایا۔ ارے توبہ یہ تو بَدے بَدے کی بات ہے سبھی کے دن ہنسی خوشی میں کٹیں تو روئے کون! یہاں تو صبح سے شام تک چولھے چکی ہی سے فرصت نہیں ملتی۔ کسی بچے کو دست آرہے ہیں تو کسی کو بخار چڑھا ہوا ہے، دن بھر ہائے ہائے کرتے بیت جاتی ہے۔ سارے دن کٹھ پتلی کی طرح ناچتی رہتی ہوں۔

تیسری صاحبہ بولیں۔ بَدے کی بات نہیں ہے، ویسا دل چاہیئے تمہیں تو کوئی راج سنگھاسن پر بٹھا دے تب بھی تسکین نہ ہوگی۔ تب اور ہائے ہائے کروگی۔

اس پر ایک ضعیفہ بولیں۔ نوج ایسا دل! یہ بھی کوئی دل ہے کہ گھر میں چاہے آگ لگ جائے، چاروں طرف کتنی ہی رسوائی ہو رہی ہو، لیکن آدمی اپنے راگ رنگ میں مست رہے! وہ دل ہے کہ پتھر؟

دوسری عورتوں نے ضعیفہ کی اس اعلانیہ چوٹ پر شرمندہ ہو کر سر جھکا لیا۔ وہ سب جاگیشوری کے چٹکیاں لینا چاہتی تھیں۔ زخمی کو تڑپانا ہی اُن کی غرض تھی۔ اس کھلی ہوئی چوٹ نے ان کی دلآزادی کے لئے کوئی گنجائش نہ رکھی۔ بات پلٹ گئی — تعلیم نسواں پر بحث ہونے لگی مگر جاگیشوری کو سزا مل گئی۔ جب مستورات رخصت ہو گئیں

تو اس نے جاکر شوہر سے یہ سارا قصہ سنایا۔ ہردے ناتھ ان بھلے آدمیوں میں نہ تھے جو ہر ایک موقعہ پر اپنی روحانی آزادی کا شور مچاتے ہیں اور زبانِ خلق کی پروا نہیں کرتے۔ متفکر ہو کر بولے تو اب ؟

"تمہیں کوئی تدبیر سوچو"

"ان لوگوں کا کہنا بے جا نہیں ہے، کیلاشی کے مزاج میں مجھے بھی ایک تبدیلی نظر آرہی ہے۔ مجھے خود تجربہ ہو رہا ہے کہ اس کے من بہلاوے کے لئے ہم نے جو تدبیر سوچی وہ مناسب نہیں ہے"

"کیلاشی تو شاید جان ہی دے دے"۔

"ہمیں اس کے مزاج کو تبدیل کرنا ہوگا"

"مشکل ہے"

(۲)

رفتہ رفتہ اصلاح ہونے لگی، بابو صاحب اب گراموفون بہت کم بجاتے، کوئی دھرم گرنتھ پڑھ کر سناتے، ماں بیٹی مذہبی اور روحانی معاملات میں محو رہنے لگیں۔ کیلاش کماری کو باقاعدہ دیکشا دے دی گئی۔

اب ماں بیٹی گنگا کی سیر کرنے کے لئے گنگا جی نہ جاتیں بلکہ اشنان کرنے کے لئے دونوں روزانہ مندرمیں درشن کرنے جاتیں اور ایکادشی کا برت رکھتیں۔ کئی مہینے تک تو کیلاشی کو یہ نئی دنیا نہایت تکلیف دہ، خشک معلوم ہوئی، پر اعتقاد عورت کا وصف ہے۔ تھوڑے ہی دنوں میں اسے ان معاملات سے دلچسپی ہو گئی۔

اب وہ سولھویں سال میں تھی۔ اپنی حالت سے بے خبر نہ تھی۔ تفریحات سے

اسے خود ہی نفرت ہونے لگی بیوہ ہونا کسی بڑے گناہ کی سزا ہے، یہ خیال اس کے دل میں راسخ ہونے لگا۔ میں نے پہلے جنم میں کوئی بڑا گناہ کیا ہوگا۔ اگر میرے شوہر زندہ ہوتے تو میں پھر مایا موہ میں پھنس جاتی، اصلاح کا موقع ہی نہ ملتا۔ گرو جی کا یہ کہنا سچ ہے کہ پرماتما نے تمہیں اصلاح کا یہ موقع دیا ہے۔ بیوگی کوئی سزا نہیں ہے بلکہ اصلاح کا ذریعہ ہے۔ میری نجات اب تیاگ بھگتی اور اُپاسنا سے ہی ہوگی "

کچھ دنوں کے بعد زہد و تقویٰ کا اثر اتنا زیادہ ہو گیا کہ کیلاش کماری کو ہر ایک سے نفرت ہونے لگی۔ کسی کو نہ چھوتی، مہریوں سے دور رہتی، سہیلیوں سے گلے تک نہ ملتی، نہ کسی کا بنایا ہوا یا چھوا ہوا کھانا کھاتی، دن میں دو تین بار اشنان کرتی، ہمیشہ کوئی نہ کوئی دھرم گرنتھ پڑھا کرتی۔ سادھو مہاتماؤں کی صحبت میں اُسے روحانی سرور حاصل ہوتا۔ جہاں کسی مہاتما کے آنے کی خبر پاتی اُن کے درشنوں کے لئے بے تاب ہو جاتی۔ یہاں تک کہ دنیا سے اُس کی طبیعت بیزار ہو گئی۔ محویت کی حالت پیدا ہوئی۔ گھنٹوں دھیان میں غرق رہتی۔ قیود تمدن سے نفرت ہونے لگی۔ تیسرا سال بھی گزرنے نہ پایا تھا کہ اُس نے سنیاسی بن جانے کا فیصلہ کر لیا۔

ماں باپ نے سُنا تو ہوش اُڑ گئے۔ جاگیشوری نے بیٹی کو سمجھایا۔ بیٹا، ابھی تمہاری عمر ہی کیا ہے کہ تم ایسی باتیں سوچتی ہو؟

کیلاش کماری: مایا موہ سے جتنی جلدی نجات ہو جائے اتنا ہی اچھا۔

ہردے ناتھ: کیا اپنے گھر میں رہ کر مایا موہ سے نجات نہیں ہو سکتی؟

مایا موہ کی جگہ دل ہے گھر نہیں،

جاگیشوری: تمہیں نہ ہو۔ ہمیں تو ہے۔ ہمیں تو تمہارا ہی سہارا ہے۔ تم نے

سنیاس لے لیا تو، ہم کس کے سہارے جئیں گے۔

کیلاش - پرماتما ہی سب کا سہارا ہے۔ کسی دوسرے کا سہارا لینا بھول ہے۔

دوسرے ہی دن یہ بات محلّے والوں کے کانوں میں پہنچ گئی۔ رائے زنی شروع ہوگئی - یہ تو ہونا ہی تھا۔ نئی بات کیا ہوئی ؟ لڑکیوں کو اس طرح آزاد نہیں کر دیا جاتا۔ پھولے نہ سماتے تھے کہ لڑکی نے خاندان کا نام روشن کر دیا۔ اپنشد اور ویدانت پڑھتی ہے - ایسی ایسی دلیلیں نکالتی ہے کہ بڑے بڑے علماء کی زبان بند ہو جاتی ہے - تو اب روتے کیوں ہیں -

اپنے بچّے کو دوڑتے گرتے پڑتے دیکھ کر ہم پہلے اُسے جھڑکتے ہیں۔ پھر گود میں اُٹھا لیتے ہیں - ان حرف گیریوں کے بعد ہمدردی کا دور آیا۔ کئی اصحاب ہردے ناتھ سے اس معاملہ میں مشورہ کرنے آئے مسئلہ کا آغاز کیونکر ہو۔

کئی منٹ کے بعد ایک صاحب بولے۔ یہ لوگ ہندو دھرم کو ملیامیٹ کر کے چھوڑیں گے -

تیسرے صاحب نے فرمایا۔ ملیامیٹ تو ہو ہی رہا ہے۔ اب اور کوئی کیا کرے گا جب ہمارے سادھو مہاتما، جو ہندو دھرم کے ستون ہیں - اتنے نفس پرست ہو گئے ہیں کہ بھولی بھالی عورتوں کو بہکا لے جانے میں بھی تامّل نہیں کرتے تو باقی ہی کیا رہ گیا ہے۔

ہردے ناتھ - یہ مصیبت تو میرے سر بھی پڑا چاہتی ہے - آپ لوگوں کو تو معلوم ہوگا۔

پہلے - آپ ہی کے سر کیوں، ہم سبھی کے سر پڑی ہوئی ہے۔

دوسرے ۔ ساری قوم کے سر کہئے صاحب!

ہردے ناتھ ۔ نجات کی کوئی تدبیر سوچئے ۔

پہلے ۔ آپ نے سمجھایا نہیں ؟

ہردے ناتھ ۔ سمجھا کے ہار گیا ۔ کچھ سنتی ہی نہیں ۔

تیسرے ۔ پہلے ہی غلطی ہوئی اُسے اس رستے پر ڈالنا ہی نہ چاہیئے تھا ۔

پہلے ۔ اب پچھتانا بے سود ہے ۔ آپ نے اخباروں میں دیکھا ہوگا کچھ لوگوں کی رائے ہے کہ بیواؤں سے اُستانیوں کا کام لینا چاہیئے ۔ اگرچہ میں بھی اس مسئلے سے متفق نہیں ہوں پر سنیاسی ہونے سے تو یہ کہیں بہتر ہے ۔ منشا تو صرف یہی ہے کہ لڑکی کا دل کسی کام میں لگا رہے ۔ کسی سہارے کے بغیر آدمی کے بھٹک جانے کا اندیشہ رہتا ہے ۔ جس گھر میں کوئی نہیں رہتا اس میں چمگادڑ بسیرا کر لیتے ہیں ۔

دوسرے ۔ تجویز تو معقول ہے ۔ محلے کی دس پانچ لڑکیاں جمع کر لی جائیں اور کام شروع کر دیا جائے ۔ لڑکیوں کو اگر کتابیں ، کاغذ ، گڑیاں وغیرہ ملتی رہیں تو شوق سے آئیں گی ۔

ہردے ناتھ نے کیلاش کماری کے سامنے یہ تجویز پیش کی تو اُسے بے حد صدمہ ہوا ۔ سنیاس کے اونچے رتبہ سے اُستانی کا درجہ بدرجہا پست تھا ۔ کہاں وہ مہاتماؤں کی صحبت وہ کوہستانی مقامات کا عارفانہ شکوہ ، قدرتی دلچسپیوں کی وہ روحانی کشش ، یہ بستہ چوٹیوں کی دید ، کہاں لڑکیوں کو پڑھانا اور سکھانا ، جو کام دس دس روپے کے مدرس کرتے ہیں ۔ مگر ہردے ناتھ مایوس نہ ہوئے ۔ برابر خدمت خلق کی عظمت اس کے دلنشین کرتے رہے ۔ اصلی سنیاس خدمت ہی ہے ۔ سنیاسی محض اپنی نجات کا

طالب ہوتا ہے - رفاہِ عام میں خود غرضی کا شائبہ بھی نہیں - خود غرضی چاہے رُوحانی ہو یا جسمانی ہے ایک محدود شئے - رفاہ عام غیر محدود ہے - دیکھوں رشتوں میں دد ہیچ کا جو رتبہ ہے، ہر یشچندر کی جو عظمت ہے وہ اور کسے حاصل ہے ؟ اس دعوی کی تائید میں اپنشدوں اور ویدوں کی نظیریں پیش کرنے - یہاں تک کہ رفتہ رفتہ کیلاش کماری کے حالات میں تغیر ہونے لگا -

(۳)

کیلاش کماری کے جوش خدمت نے سیلابی صورت اختیار کی - سارے دن لڑکیوں کو لئے بیٹھی رہتی، کبھی پڑھاتی، کبھی ان کے ساتھ کھیلتی، کبھی سینا پرونا سکھاتی - پاٹ شالہ اس کی دلچسپیوں کا مرکز بن گیا - کوئی لڑکی بیمار ہو جاتی تو فوراً اس کے گھر جاتی اس کی تیمار داری کرتی - غریب لڑکیوں کے لئے خود کھانے کپڑے کا انتظام کرتی - ان میں سے کسی کی شادی درپیش ہوتی تو چندہ کرکے روپیہ جمع کرتی -

پاٹ شالہ کو کھلے ہوئے دو سال ہو گئے تھے - ایک لڑکی کو جسے وہ بہت پیار کرتی تھی چیچک نکل آئی - کیلاشی اسے دیکھنے گئی - ماں باپ نے بہت روکا مگر وہ نہ مانی - کہا فوراً لوٹ آؤں گی - لڑکی کی حالت خراب تھی - مگر کہاں تو روتے روتے تالو سوکھتا تھا، کہاں کیلاشی کو دیکھتے ہی ہنسنے لگتی - کیلاشی وہاں ایک گھنٹہ رہی، لڑکی برابر اس سے باتیں کرتی رہی - لیکن جب وہ چلنے کو اٹھی تو لڑکی پھر رونے لگی - کیلاشی مجبور ہو کر بیٹھ گئی - تھوڑی دیر کے بعد جب وہ پھر اُٹھی تو لڑکی کی وہی حالت ہوئی - وہ اسے کسی طرح چھوڑتی ہی نہ تھی - سارا دن وہیں گزر گیا - رات کو بھی لڑکی نے نہ آنے دیا - ہردے ناتھ اسے بلانے کو بار بار آدمی بھیجتے پر وہ

لڑکی کو چھوڑ کر نہ جا سکتی۔ اُسے خوف ہو رہا تھا کہ میں یہاں سے چلی اور لڑکی ہاتھ سے گئی۔ اس کی ماں سوتیلی تھی۔ اس لئے کیلاشی کو اُس کی جانب سے اطمینان نہ ہوتا تھا۔ اس طرح وہ متواتر تین دن تک وہاں رہی۔ جب چوتھے دن لڑکی کی حالت سنبھل گئی تو وہ گھر آئی مگر ابھی لیٹے اُتار رہی تھی کہ لڑکی کے گھر سے آدمی پہنچا کہ جلدی چلئے، لڑکی رو رو کر جان دے رہی ہے۔

ہردے ناتھ نے کہا، کہدو شفاخانے سے کوئی نرس بلوالیں۔

کیلاشی۔ دادا آپ فضول بگڑ رہے ہیں، اس غریب کی جان بچ جائے، میں تین دن نہیں تین مہینے اس کی خدمت کو تیار ہوں۔ آخر یہ جسم کس کام آئے گا۔

ہردے ناتھ۔ تو یہ لڑکیاں کیسے پڑھیں گی؟

کیلاشی۔ دو چار دن میں وہ اچھی ہو جائے گی، دانے مرجھا چلے ہیں تب تک آپ لڑکیوں کی دیکھ بھال کرتے رہیئے گا۔

ہردے ناتھ۔ چھوت کا بھی تو خوف ہے۔ یہ بیماری چھوت سے پھیلتی ہے۔

کیلاشی۔ (ہنس کر) مرجاؤں گی تو آپ کے سر سے ایک بلا ٹل جائے گی۔ یہ کہتے ہوئے اُس نے اُدھر کی راہ لی۔ ماں ہاں ہاں کرتی رہ گئی۔ ہردے ناتھ نے جاگیشوری سے کہا۔ معلوم ہوتا ہے بہت جلد یہ پاٹ شالہ بھی بند کرنی پڑے گی۔ جس راستے پر چلتا ہوں وہی کچھ دنوں کے بعد دلدل بن جاتا ہے۔ اب پھر بدنامی کے سامان ہوتے نظر آرہے ہیں۔ لوگ کہیں گے لڑکی دوسروں کے گھر کئی کئی دن پڑی رہتی ہے۔ پاٹ شالا بند کرنی پڑے گی۔

جاگیشوری۔ اس کے سوا اور ہو ہی کیا سکتا ہے؟

کیلاش کماری دو دن کے بعد لوٹی تو ہردے ناتھ نے پاٹ شالہ بند کر دینے کی تجویز پیش کی۔ کیلاشی نے گرم ہو کر کہا۔ اگر آپ کو بدنامی کا اتنا خوف ہے تو مجھے زہر دے دیجئے اس کے سوا بدنامی سے بچنے کی کوئی تدبیر نہیں۔

ہردے ناتھ۔ بیٹی دنیا میں رہ کر دنیا ہی کا طرز اختیار کرنا پڑتا ہے۔

کیلاشی۔ تو کچھ معلوم بھی تو ہو کہ دنیا مجھ سے کیا چاہتی ہے۔ مجھ میں عقل ہے، جان ہے، ہوش ہے، جانور کیسے بن جاؤں۔ مجھ سے یہ نہیں ہو سکتا کہ اپنے کو ابھاگنی سمجھوں اور ایک ٹکڑا روٹی کھا کر پڑی رہوں۔ ایسا کیوں کروں؟ سنسار مجھے جو چاہے سمجھے۔ میں اپنے آپ کو ابھاگنی نہیں سمجھتی۔ میں اپنی حفاظت آپ کر سکتی ہوں۔ میں اسے اپنی ذلت سمجھتی ہوں کہ قدم قدم پر مجھ پر شک کیا جائے۔ ہمیشہ چرواہے کی طرح کوئی لاٹھی لئے میرے پیچھے گھومتا رہے کہ کسی کے کھیت میں نہ جا پڑوں۔ یہ حالت میرے لئے ناقابلِ برداشت ہے۔

پاٹ شالا دوسرے دن بند ہو گئی۔

(۴)

تیج کا دن آیا۔ گھروں میں صفائی ہونے لگی۔ عورتیں اس تقریب کی تیاریاں کرنے لگیں۔ جاگیشوری نے بھی برت کا سامان کیا۔ نئی نئی ساڑیاں منگوائیں۔ کیلاشی کے سسرال سے اس موقعہ پر کپڑے، مٹھائیاں اور کھلونے آیا کرتے تھے۔ اب کے بھی آئے۔ یہ سہاگن عورتوں کا برت ہے لیکن ہوائیں بھی رکھتی ہیں کیونکہ شوہر سے ان کا محض جسمانی تعلق نہیں ہوتا۔ یہ دائمی اور روحانی تعلق ہے۔ کیلاش کماری اب تک یہ برت رکھتی آئی تھی۔ اب کی اس نے فیصلہ کیا یہ برت نہ رکھوں گی۔ ماں نے سنا تو

ماتھا ٹھونک لیا۔ بولی یہ برت رکھنا تمہارا دھرم ہے۔

کیلاشی ۔ مرد بھی عورت کے نام پر کوئی برت رکھتے ہیں ؟

جاگیشوری ۔ مردوں میں یہ رسم نہیں ہے۔

کیلاشی ۔ اس لئے نہ کہ مردوں کو عورتوں کی جان اتنی پیاری نہیں ہوتی جتنی عورتوں کو مردوں کی ؟

جاگیشوری ۔ عورت مرد کی برابری کیسے کر سکتی ہے اُس کا تو دھرم ہی ہے مرد کی خدمت کرنا۔

کیلاشی ۔ میں اسے اپنا دھرم نہیں سمجھتی میرے لئے اپنی اصلاحِ نفس کے سوا کوئی دوسرا دھرم نہیں ہے۔

جاگیشوری ۔ بیٹی غضب ہو جائے گا، دنیا کیا کہے گی۔

کیلاشی ۔ پھر وہی دنیا! مجھے دنیا سے کوئی مطلب نہیں۔ جس دنیا میں میرے لئے اینٹ اور پتھر کے سوا اور کچھ نہیں، اس دنیا سے میں نہیں ڈرتی۔

ہردے ناتھ نے جاگیشوری سے یہ باتیں سُنیں تو سناٹے میں آ گئے۔ ان باتوں کا مطلب کیا ہے ؟ یہ اصلاحِ نفس کا جذبہ ہے یا ٹوٹے ہوئے مجروح دل کی صدا؟ بے نوائی شرم کا احترام نہیں کرتی۔ یہ حرماں نصیب کا نالۂ درد ہے! عام حالتوں میں حزن و یاس بے کسی کی صورت میں نمودار ہوتا ہے۔ خود دار آدمیوں میں وہ بد دماغ ہو جاتا ہے۔ دل کے نازک جذبات کو فنا کر دیتا ہے۔ یہ مایوسی کا آخری درجہ ہے۔

جاگیشوری نے پوچھا۔ "اب کیا کرنا ہو گا؟"

"کیا بتاؤں"۔

"کوئی تدبیر ہے؟"

"بس ایک ہی تدبیر ہے پر اُسے زبان پر نہیں لا سکتا۔"

(فردوسیِ خیال)

دُودھ کی قیمت

اب بڑے بڑے شہروں میں دائیاں اور نرسیں بھی نظر آتی ہیں، لیکن دیہاتوں میں ابھی تک زچہ خانہ روش قدیم کی طرح بھنگیوں کے ہی دائرۂ اقتدار میں ہے اور ایک عرصۂ دراز تک اس میں اصلاح کی کوئی امید نہیں۔ بابو مہیش ناتھ اپنے گاؤں کے زمیندار ضرور تھے۔ تعلیم یافتہ بھی تھے، زچہ خانہ کی اصلاح کی ضرورت کو بھی تسلیم کرتے تھے لیکن عملی مشکلات کو کیا کرتے۔ دیہات میں جانے کو کوئی نرس راضی بھی ہوئی تو ایسا معاوضہ طلب کیا کہ بابو صاحب کو سر جھکا کر چلے آنے کے سوا کوئی تدبیر نہ سوجھی۔ لیڈی ڈاکٹر کے پاس جانے کی انہیں ہمت ہی کیونکر ہو سکتی۔ ان کا حق التخدمت تو غالباً بابو صاحب کی نصف ملکیت بیع کرنے پر بھی نہ پورا ہوتا۔ آخر جب تین لڑکیوں کے بعد یہ چوتھا لڑکا پیدا ہوا تو پھر وہی گوڈر تھا اور گوڈر کی بہو۔ بچے بیشتر رات ہی کو پیدا ہوتے ہیں۔ چنانچہ آدھی رات کو بابو صاحب کے چپراسی نے گوڈر! گوڈر!! کی ہانک لگائی کہ چمار دل

کی ٹولی جاگ اُٹھی۔

گوڈر کے گھر میں اس روزِ سعید کی مہینوں سے تیاری تھی۔ خدشہ تھا تو یہی کہ کہیں بیٹی نہ ہو جائے نہیں تو پھر وہی بندھا ہوا ایک روپیہ اور وہی ایک ساڑی مل کر رہ جائے گی۔ اس مسئلہ پر میاں بیوی میں بارہا تبادلۂ خیال ہو چکا تھا۔ شرطیں لگ چکی تھیں۔ گوڈر کی بہو کہتی تھی کہ اگر اب کے بیٹا نہ ہو تو منہ نہ دکھاؤں۔ ہاں ہاں منہ نہ دکھاؤں۔ اور گوڈر کہتا تھا کہ دیکھو بیٹی ہو گی اور بیچ کھیت بیٹی ہو گی۔ بیٹا پیدا ہوا تو مونچھیں منڈوالوں گا۔ شاید گوڈر سمجھتا کہ اسی طرح بھنگی میں مخالفانہ جوش پیدا کر کے وہ بیٹے کی آمد کے لئے راستہ تیار کر رہا ہے۔

بھنگی بولی۔ "اب منڈالے مونچھیں ڈاڑھی جا۔ کہتی تھی بیٹا ہو گا پر سُنے ہی نہیں۔ اپنی رٹ لگائے۔ کھُد تیری مونچھیں مونڈوں گی، کھونٹی تو رکھوں نہیں۔"

گوڈر نے کہا: "اچھا مونڈ لینا بھلی مانس، مونچھیں کیا پھر نکلیں گی ہی نہیں تیرے دن پھر دیکھے گی جوں کی توں ہیں مگر جو کچھ ملے گا اس میں آدھا رکھ لوں گا۔ کہے دیتا ہوں۔"

بھنگی نے انگوٹھا دکھایا اور اپنے تین مہینے کے بچے کو گوڈر کے سپرد کر کے سپاہی کے ساتھ چل دی۔

گوڈر نے پکارا: "اری سُن تو کہاں بھاگی جاتی ہے۔ مجھے بھی تو روشن چوکی بجانے جانا پڑے گا۔"

بھنگی نے دُور ہی کہا۔ "تو کون بڑی مشکل ہے ہاں دھرتی پر لٹا دینا اور روشن چوکی بجانا۔ میں آکر دودھ پلا دیا کروں گی۔"

(۲)

مہیش ناتھ کے ہاں اب کے بھنگی کی خوب خاطر کی گئی۔ صبح کو حریرہ ملتا، دوپہر کو پوریاں اور حلوا۔ تیسرے پہر کو پھر اور رات کو پھر اور گوڈر کو بھی بھرپور پروسا ملتا تھا۔ بھنگی اپنے بچے کو دن بھر میں دو بار سے زیادہ دودھ نہ پلا سکتی۔ اُس کے لئے اوپر کا دودھ مہیا کر دیا جاتا۔ بھنگی کا دودھ بابو صاحب کا بچہ پیتا تھا اور یہ سلسلہ بارھویں دن بھی نہ بند ہوا۔ مالکن موٹی تازی عورت تھیں، مگر اب کے کچھ ایسا اتفاق کہ دودھ ہوا ہی نہیں۔ تینوں لڑکیوں کی بار اتنے افراط سے دودھ ہوتا تھا کہ لڑکیوں کو بدہضمی ہو جاتی تھی۔ اب کی ایک بوند نہیں۔ بھنگی جنالی بھی تھی اور دودھ پلائی بھی۔

مالکن نے کہا: "بھنگی ہمارے بچے کو پال دے پھر جب تک جئے بیٹھی کھاتی رہنا پانچ بیگھے معافی دلوا دوں گی۔ تیرے پوتے تک کھائیں گے۔"

اور بھنگی کا لاڈلا اوپر کا دودھ نہ ہضم کر سکنے کے باعث بار بار قے کرتا اور روز بروز لاغر ہوتا جاتا تھا۔ بھنگی کہتی "اور مونڈن میں چوڑے لوں گی بہو جی میں کہے دیتی ہوں۔"

بہو جی۔" ہاں ہاں چوڑے لینا بھائی۔ دھمکاتی کیوں ہے۔ چاندی کے لے گی یا سونے کے؟"

"واہ بہو جی واہ، چاندی کے چوڑے پہن کے کسے منہ دکھاؤں گی۔"

بہو جی۔" اچھا سونے کے لے لینا بھائی کہتی تو ہوں۔"

" اور بیاہ میں کنٹھا لوں گی اور چودھری (گوڈر) کے لئے ہاتھوں کے توڑے۔"

بہو جی ۔" وہ بھی لینا ۔ وہ دن تو بھگوان دکھائیں "۔

گھر میں مالکن کے بعد بھنگی کی حکومت تھی ۔ مہریاں ، مہراجن ، مزدورنیاں سب اس کا رعب مانتی تھیں ۔ یہاں تک کہ خود بہو جی اس سے دب جاتی تھیں ۔ ایک بار تو اُس نے مہیش ناتھ کو بھی ڈانٹا تھا ۔ ہنس کر ٹال گئے ۔ بات چلی تھی بھنگیوں کی مہیش ناتھ نے کہا تھا ۔" دنیا میں اور چاہے جو کچھ ہو جائے ۔ بھنگی بھنگی رہیں گے انھیں آدمی بنانا مشکل ہے "

اس پر بھنگی نے کہا تھا ۔" مالک بھنگی تو بڑے بڑوں کو آدمی بناتے ہیں اُنہیں کیا کوئی آدمی بنائے گا ۔"

یہ گستاخی کر کے کسی دوسرے موقعہ پر بھلا بھنگی سلامت رہتی ۔ سر کے بال اُکھاڑ لئے جاتے ۔ لیکن آج بابو صاحب ہنسے قہقہہ مار کر بولے ۔" بھنگی بات بڑے پتے کی کہتی ہے ۔"

(۳)

بھنگی کی حکومت سال بھر تک قائم رہی پھر چھین گئی ، بچے کا دودھ چھڑا دیا گیا ۔ اب برہمنوں نے بھنگی کا دودھ پینے پر اعتراض کیا ۔ موتے رام شاستری تو پرائشچت کی تجویز کر بیٹھے ۔ لیکن مہیش ناتھ احمق نہ تھے ۔ پھٹکار بتائی ۔ پرائشچت کی خوب کہی آپ نے شاستری جی ۔ کل تک بھنگن کا خون پی کر پلا اب پرائشچت کرنا چاہیئے ۔ واہ ! "

شاستری جی بولے ۔" بیشک کل تک بھنگن کا خون پی پلا کر پلا ۔ گوشت کھا کر پلا یہ بھی کہہ سکتے ہو ۔ لیکن کل کی بات کل ہے ۔ آج کی بات آج ہے ۔ بھنگن ناتھ پوری

میں تو چھوت اچھوت سب ایک ساتھ کھاتے ہیں، مگر یہاں تو نہیں کھا سکتے۔ کھچڑی تک کھا لیتے ہیں۔ بابو جی اور کیا کہیں پوری تک نہیں رہ جاتے لیکن اچھے ہو جانے پر تو نہیں کھا سکتے۔"

"تو اس کے معنی یہ ہیں کہ دھرم بدلتا رہتا ہے۔ کبھی کچھ، کبھی کچھ"۔ اور کیا راجہ کا دھرم الگ، پرجا کا دھرم الگ، امیر کا دھرم الگ، غریب کا دھرم الگ۔ راجے مہاراجے جو چاہیں کھائیں، جس کے ساتھ چاہیں کھائیں، جس کے ساتھ چاہیں شادی بیاہ کریں ان کے لئے کوئی قید نہیں، راجہ ہیں۔ مگر ہمارے اور تمہارے لئے تو قدم قدم پر بندشیں ہیں۔ قیدیں ہیں۔ اس کا دھرم ہے، پر ایشچت تو نہ ہوا لیکن بھنگی سے اس کی سلطنت چھین لی گئی، برتن، کپڑے، اناج اتنی کثرت سے ملے کہ وہ اکیلی نہ لے جا سکی اور سونے کے چوڑے بھی ملے۔ اور ایک دو نئی اور خوبصورت ساڑیاں معمولی نین سکھ کی نہیں جیسی لڑکیوں کی بارلی تھیں۔

(۴)

اُسی سال چیچک کا زور ہوا، گوڈر پہلے ہی زد میں آگیا۔ بھنگی اکیلی رہ گئی۔ مگر کام جوں کا توں چلتا رہا۔ بھنگی کے لئے گوڈر اتنا ضروری نہ تھا جتنا گوڈر کے لئے بھنگی، لوگ منتظر تھے کہ بھنگی اب گئی، اب گئی۔ فلاں بھنگی سے بات چیت ہوئی۔ فلاں چودھری آئے، لیکن بھنگی کہیں نہ گئی۔ یہاں تک کہ پانچ سال گزر گئے اور منگل دبلا اور کمزور اور دائم المریض رہنے پر بھی دوڑنے لگا۔ ماں کا دودھ نصیب ہی نہ ہوا دائم المریض کیوں نہ رہتا۔

ایک دن بھنگی مہیش ناتھ کے مکان کا پرنالہ صاف کر رہی تھی۔ مہینوں سے

غلاظت جمع ہو گئی تھی۔ آنگن میں پانی بھرا رہنے لگا تھا۔ پرنالے میں ایک لمبا موٹا بانس ڈال کر زور سے ہلا رہی تھی۔ پورا پورا داہنا ہاتھ پرنالے کے اندر تھا کہ یکایک اُس نے چلّا کر ہاتھ باہر نکال لیا۔ اور اسی وقت ایک لمبا سا کالا سانپ پرنالے سے نکل کر بھاگا۔ لوگوں نے دوڑ کر اُسے تو مار ڈالا لیکن بھنگی کو نہ بچا سکے۔ خیال تھا کہ پانی کا سانپ ہے زیادہ زہریلا نہ ہوگا۔ اسی سے پہلے کچھ غفلت کی گئی۔ جب زہر جسم میں پیوست ہوا اور لہریں آنے لگیں تب پتہ چلا کہ پانی کا سانپ نہیں کالا سانپ تھا۔

منگل اب یتیم تھا۔ دن بھر مہیش بابو کے دروازے پر منڈلایا کرتا۔ گھر میں اتنا جھوٹا بچا کہ ایسے ایسے دس پانچ سیر ہو سکتے تھے۔ منگل کو کوئی تکلیف نہ تھی ہاں دُور ہی سے اُسے مٹی کے ایک سکورے میں کھانا ڈال دیا جاتا اور گاؤں کے لڑکے اُس سے دُور دور رہتے تھے۔ یہ بات اسے اچھی نہ لگتی تھی۔ سب لوگ اچھے اچھے برتنوں میں کھاتے ہیں، اس کے لئے مٹی کے سکورے! یوں اُسے اس تفریق کا مطلق احساس نہ ہوتا۔ لیکن لڑکے اسے چڑھا چڑھا کر اس ذلت کے احساس کو سان پر چڑھاتے تھے۔ مکان کے سامنے ایک نیم کا درخت تھا۔ اسی کے نیچے منگل کا ڈیرا تھا۔ ایک پھٹا پھٹا سا ٹاٹ کا ٹکڑا، وہ سکورے اور ایک دھوتی جو مہیش بابو کے خوش نصیب فرزند سریش کے اتارے کپڑوں میں تھی جاڑا، گرمی، برسات ہر موسم کے لئے وہ جگہ ایک سی آرام دہ تھی۔ یہی اس کی خصوصیت تھی اور سخت جان منگل جھلستی ہوئی لُو اور کڑاکے کے جاڑے اور موسلا دھار بارش میں بھی زندہ تھا اور تندرست تھا۔ بس اس کا کوئی رفیق تھا تو گاؤں کا ایک کتّا جو اپنے ہم چشموں کی

بدمزاجیوں اور تنگ ظرفیوں سے تنگ آکر منگل کے زیرِ سایہ آپڑا تھا۔ کھانا دونوں کا ایک تھا کچھ طبیعت بھی یکساں تھی اور غالباً دونوں ایک دوسرے کے مزاج سے واقف ہوگئے تھے۔

منگل نے اس کا نام رکھا تھا ٹامی مگر ٹامی مہیش ناتھ کے انگریزی کتے کا نام تھا اِس لئے اس نام کا استعمال وہ اسی وقت کرتا جب دونوں رات کو سونے لگتے۔

منگل کہتا "دیکھو ٹامی، ذرا اور کھسک کر سوؤ آخر میں کہاں لیٹوں، سارا ٹاٹ تو تم نے گھیر لیا۔ ٹامی کوں، کوں کرتا اور دم ہلاتا اور بجائے اس کے کہ کھسک جائے اور اوپر چڑھا آتا اور منگل کا منہ چاٹنے لگتا۔ شام کو وہ ایک بار روز اپنا گھر دیکھنے اور تھوڑی دیر رونے جاتا۔ پہلے سال پھوس کا چھپر گرا۔ دوسرے سال ایک دیوار گری اور اب صرف آدھی دیواری کھڑی تھیں جن کا اوپر کا حصّہ نوکدار ہوگیا تھا۔ یہیں اُسے محبّت کی دولت ملی تھی، وہی مزہ، وہی یاد، وہی کشش اسے ایک بار اس ویرانے میں کھینچ لے جاتی تھی اور ٹامی ہمیشہ اس کے ساتھ ہوتا تھا وہ کھنڈر کی محزوطی دیوار پر بیٹھ جاتا اور زندگی کے آنے والے اور گزشتہ خواب دیکھنے لگتا۔ اور ٹامی دیوار پر کود جانے کی بار بار ناکام کوشش کرتا۔

(۵)

ایک دن کئی لڑکے کھیل رہے تھے۔ منگل بھی پہنچ کر دور کھڑا ہوگیا۔ سریش کو اس پر رحم آیا۔ یا کھیلنے والوں کی جوڑی پوری نہ پڑتی تھی کچھ ہی ہو۔ اس نے تجویز کی آج منگل کو بھی کھیل میں شریک کرلیا جائے۔ یہاں کون دیکھنے آتا ہے۔

سریش نے منگل سے پوچھا۔ "کیوں رے کھیلے گا؟"

منگل بولا۔ "کھلاؤ گے تو کیوں نہ کھیلوں گا"

سریش۔ "اچھا تو ہم تینوں سوار بنتے ہیں تم ٹٹو بن جاؤ۔ پھر ہم لوگ تمہارے اوپر سوار ہو کر گھوڑا دوڑائیں گے۔"

منگل نے پوچھا۔ "میں برابر گھوڑا ہی رہوں گا کہ سواری بھی کروں گا۔"

یہ مسئلہ ٹیڑھا تھا۔ سریش نے ایک لمحہ غور کر کے کہا۔ "تجھے کون اپنی پیٹھ پر بٹھائے گا سوچ آخر تو بھنگی ہے کہ نہیں"۔ منگل نے کسی قدر دلیر ہو کر کہا۔ "میں کب کہتا ہوں کہ میں بھنگی نہیں ہوں۔ لیکن جب تک مجھے سواری کرنے کو نہ ملے گی میں گھوڑا نہ بنوں گا۔ تم لوگ سوار بنو گے اور میں گھوڑا ہی بنا رہوں گا۔"

سریش نے تحکمانہ لہجہ میں کہا۔ "تجھے گھوڑا بننا پڑے گا۔" اُس نے منگل کو پکڑنا چاہا۔ منگل بھاگا۔ سریش نے دوڑایا۔ منگل نے قدم اور تیز کیا۔ سریش نے بھی زور لگایا۔ مگر بسیار خوری نے اُسے تھل تھل بنا دیا تھا اور دوڑنے سے اُس کا سانس پھولنے لگتا تھا۔ آخر سریش نے رُک کر کہا۔ "آ کر گھوڑا بنو منگل، نہیں کبھی پاؤں گا تو بُری طرح پیٹوں گا۔"

"تمہیں بھی گھوڑے بننا پڑے گا۔"

"اچھا ہم بھی بن جائیں گے۔"

سریش نے چکمہ دیا تھا۔ منگل کے اس مطالبے نے برہم کر دیا۔ ساتھیوں سے بولا دیکھو اس کی بدمعاشی۔ بھنگی ہے"۔ تینوں نے اب منگل کو گھیر لیا اور زبردستی گھوڑا بنا دیا۔ سریش اپنا وزنی جسم لے کر اس کی پیٹھ پر بیٹھ گیا اور ٹک ٹک کر کے بولا۔ "چل گھوڑے چل" مگر اس کے بوجھ کے نیچے غریب منگل کا ہلنا بھی مشکل تھا، دوڑنا تو دور کی بات تھی۔

ایک لمحہ تو وہ ضبط کئے چوپایہ بنا کھڑا رہا لیکن ایسا معلوم ہونے لگا کہ ریڑھ کی ہڈی ٹوٹی جاتی ہے۔ اس نے آہستہ سے پیٹھ سکوڑی اور سریش کی ران کے نیچے سے سرک گیا۔ سریش گدے سے گر پڑے اور بھونپو بجانے لگے۔ ماں نے سنا سریش کہیں رو رہا ہے۔ گاؤں میں کہیں سریش روئے، ان کے ذکی الحس کانوں میں ضرور آواز آجاتی تھی۔ اور اس کا رونا تھا بھی دوسرے لڑکوں سے بالکل نرالا جیسے چھوٹی لائن کے انجن کی آواز۔

ایک منٹ میں سریش روتا ہوا گھر میں آیا۔ آپ کو جب کبھی رونے کا اتفاق ہوتا تو گھر میں فریاد لے کر ضرور آتے تھے۔ ماں چپ کرنے کے لئے کچھ نہ کچھ دے دیتی تھی۔ آپ تھے تو آٹھ سال کے مگر بہت بیوقوف۔ حد سے زیادہ پیار سے، ماں نے پوچھا۔ "کیوں روتا ہے سریش؟ کس نے مارا؟" سریش نے روتے ہوئے کہا "منگل نے چھوا دیا"۔ پہلے تو ماں کو یقین نہ آیا۔ لیکن جب سریش قسمیں کھانے لگا تو یقین لانا لازم ہو گیا۔ اُس نے منگل کو بلوایا اور ڈانٹ کر بولی۔ "کیوں رے منگلوا اب تجھے بدمعاشی سوجھنے لگی۔ میں نے تجھ سے کہا تھا کہ کبھی سریش کو چھونا نہیں! یاد ہے کہ نہیں، بول"۔ منگل نے دبی آواز سے کہا "یاد ہے"۔ تو پھر تو نے اسے کیوں چھوا تو نے نہیں چھوا تو یہ روتا کیوں تھا؟" "یہ گر پڑے اس لئے رونے لگے۔"

چوری اور سینہ زوری - دیوی دانت پیس کر رہ گئیں۔ مارتیں تو اسی وقت اشنان کرنا پڑتا۔ قمچی تو ہاتھ میں لینا ہی پڑتی اور چھوت کی برقی رَو قمچی کے راستہ ان کے جسم میں سرایت کر جاتی۔ اس لئے جہاں تک گالیاں دے سکیں دیں اور حکم دیا کہ اسی وقت یہاں سے نکل جا۔ پھر جو تیری صورت نظر آئی تو خون ہی پی جاؤں گی۔ مفت کی روٹیاں کھا کھا کر شرارت سوجھتی ہے۔"

منگل میں غیرت تو کیا ہو گی، خوف تھا۔ چپکے سے اپنے سکورے اُٹھائے اور ٹاٹ کا ٹکڑا بغل میں دبایا۔ دھوتی کندھے پر رکھی اور روتا ہوا وہاں سے چل پڑا اب وہ یہاں کبھی نہ آئے گا۔ یہی تو ہو گا بھوکوں مر جائے گا۔ کیا ہرج ہے۔ اس طرح جینے سے فائدہ ہی کیا۔ گاؤں میں اور کہاں جاتا۔ بھنگی کو کون پناہ دیتا۔ وہی اپنے بے درد دیوار کی آڑ تھی، جہاں پہلے دنوں کی یادگاریں اس کے آنسو پونچھ سکتی تھیں، وہیں جا کر پڑ رہا اور خوب پھوٹ پھوٹ کر رویا۔ ابھی آدھ گھنٹہ بھی نہ گزرا تھا کہ ٹامی بھی اُسے ڈھونڈتا ہوا آ پہنچا۔

لیکن جوں جوں شام ہوتی تھی اُس کا احساسِ ذلت بھی غائب ہو جاتا تھا۔ بچپن کی بے تاب کن بھوک جسم کا خون پی پی کر اور بھی بے پناہ ہو جاتی تھی آنکھیں بار بار سکوروں کی طرف اُٹھ جاتیں۔ اس نے مشورۃً ٹامی سے کہا کھاؤ گے کیا۔ میں تو بھوکا ہی لیٹ رہوں گا۔ ٹامی نے کوں کوں کر کے شاید کہا۔ اس طرح کی دھمکیاں تو ساری عمر سُنی ہیں، اگر ہمت ہار گئے تو کیسے کام چلے گا۔ مجھے دیکھو نہ ابھی کسی نے ڈنڈا مارا چیخ پڑا۔ پھر ذرا دیر کے بعد دم ہلاتا ہوا اُس کے پاس جا پہنچا۔ ہماری زندگی اسی لئے ہے بھائی۔

منگل بولا۔ "تم جاؤ جو کچھ مل جائے کھا لو۔ میری پروا نہ کرو۔" ٹامی نے پھر اپنی سگستانی بولی میں کہا۔ اکیلا نہیں جاتا تمہیں ساتھ لے کر چلوں گا۔" ایک لمحہ بعد بھوک نے تالیف کا ایک پہلو اختیار کیا۔ "مالکن تلاش کر رہی ہوں گی، کیوں ٹامی؟" "اور کیا بابو جی اور سریش کھا چکے ہوں گے۔ کہار نے ان کی تھالی کا جھوٹا نکال لیا ہو گا اور ہمیں پکار رہا ہو گا۔" "بابو جی اور سریش دونوں کی تھالیوں میں

گھی اور وہ میٹھی میٹھی چیز، ہاں ملائی"۔ ہماری آواز نہ سنائی دے گی تو سب کا سب گھورے پر ڈال دیں گے۔ ذرا دیکھ لیں کہ ہمیں کوئی پوچھنے آتا ہے"۔ "یہاں کون پوچھنے آئے گا کوئی بامن ہو"۔

"اچھا تو چلو وہیں چلیں مگر چھپے ہوئے رہیں گے۔ اگر کسی نے نہ پکارا تو میں لوٹ آؤں گا۔ یہ سمجھ لو۔"

دونوں وہاں سے نکلے اور آکر مہیش ناتھ کے دروازے پر ایک کونے میں دبک کر کھڑے ہو گئے۔ ٹامی شاید ادھر ادھر کی خبر لانے چلا گیا۔ مہیش بابو تھالی پر بیٹھ گئے تھے۔ نوکروں کی بات چیت سے معلوم ہوتا تھا ایک نے کہا۔ آج منگلو نہیں دکھائی دیتا بھوکا ہوگا بچارا۔ مالکن نے ڈانٹا تھا اسی لئے بھاگا ہے شاید"۔ منگل کے جی میں آیا چل کر اس آدمی کے قدموں پر گر پڑے۔ دوسرے نے جواب دیا۔" اچھا ہوا نکالا گیا۔ نہیں سبیرے سبیرے بھنگی کا منہ دیکھنا پڑتا تھا"۔ منگل اور اندھیرے میں کھسک گیا۔ اب کیا اُمید کی جا سکتی تھی۔ مہیش اور سریش تھالی سے اُٹھ گئے نوکر ہاتھ منہ دُھلا رہا ہے۔ بابو جی اب حقہ پئیں گے۔ سریش سوئے گا۔ غریب منگل کی کسے فکر ہے۔ اتنی دیر ہو گئی کسی نے نہیں پکارا، کون پکارے گا۔ منگل آدھ گھنٹہ تک وہاں دبکا کھڑا رہا۔ کسی نے اُس کا نام نہ لیا۔ اس نے ایک لمبی سانس لی اور جانا ہی چاہتا تھا کہ اس نے اسی کہار کو ایک تھال میں جھوٹا کھانا لے جاتے دیکھا۔ شاید گھورے پر ڈالنے جا رہا تھا۔ منگل اندھیرے سے نکل کر روشنی میں آ گیا تھا۔ اب صبر نہ ہو سکتا تھا۔ کہار نے کہا" ارے تو یہاں تھا ہم نے سمجھا کہیں چلا گیا، لے کھالے، میں پھینکنے لے جا رہا تھا۔" منگل نے کہا" میں تو بڑی دیر

سے یہاں کھڑا تھا۔" "تو بولا کیوں نہیں۔" "ڈر لگتا تھا۔" "اچھا لے کھالے۔" منگل نے تھال اس کے ہاتھ سے لے لیا اور اُسے ایسی نظر سے دیکھا جس میں شکر اور احسانمندی کی ایک دنیا چھپی ہوئی تھی۔ پھر وہ دونوں نیم کے درخت کے نیچے حسب معمول کھانے لگے۔ منگل نے ایک ہاتھ سے ٹامی کا سر سہلا کر کہا "دیکھا پیٹ کی آگ ایسی ہوتی ہے۔ رات کی ماری ہوئی روٹیاں بھی نہ ملتیں تو کیا کرتے۔" ٹامی نے دم ہلائی۔ "سریش کو اماں ہی نے پالا ہے ٹامی"۔ ٹامی نے پھر دم ہلادی۔ "لوگ کہتے ہیں دودھ کا دام کوئی نہیں چکا سکتا۔" ٹامی نے پھر دم ہلادی "اور مجھے دودھ کا یہ دام مل رہا ہے۔" ٹامی نے پھر دم ہلادی۔

(دودھ کی قیمت)

دو بہنیں

دو بہنیں دو سال کے بعد ایک تیسرے عزیز کے گھر ملیں اور خوب رو دھو کر خاموش ہوئیں تو بڑی بہن روپ کماری نے دیکھا کہ چھوٹی بہن رام دلاری سر سے پاؤں تک گہنوں سے لدی ہوئی ہے۔ کچھ اس کا رنگ کھُل گیا ہے۔ مزاج میں کچھ تمکنت آگئی ہے اور بات چیت کرنے میں زیادہ مشّاق ہو گئی ہے۔ بیش قیمت ساری اور بیلدار عنابی مخمل کے جمپر نے اس کے حُسن کو اور بھی چمکا دیا ہے۔ وہی رام دلاری جو لڑکپن میں سر کے بال کھولے پھوہڑ سی ادھر ادھر کھیلا کرتی تھی۔ آخری بار روپ کماری نے اسے اس کی شادی میں دیکھا تھا۔ دو سال قبل تب بھی اُس کی شکل و صورت میں کچھ زیادہ تغیر نہ ہوا تھا۔ لمبی تو ہو گئی تھی مگر تھی اتنی ہی دُبلی، اتنی ہی زرد رُو۔ اتنی ہی بدتمیز۔ ذرا ذرا سی بات پر روٹھنے والی۔ مگر آج تو حالت ہی کچھ اور تھی، جیسے کلی کھل گئی ہو۔ اور حُسن اس نے کہاں چھپا رکھا تھا۔ نہیں نظروں کو دھوکا ہو رہا

یہ حسن نہیں محض دیدہ زیبی ہے۔ ریشم اور مخمل اور سونے کی بدولت نقشہ تھوڑا ہی بدل جائے گا۔ پھر بھی وہ آنکھوں میں سمائی جاتی ہے۔ پچاسوں عورتیں جمع ہیں مگر یہ سحر یہ کشش اور کسی میں نہیں اور اس کے دل میں حسد کا ایک شعلہ سا دہک اُٹھا۔

کہیں آئینہ ملتا تو وہ ذرا اپنی صورت بھی دیکھتی۔ گھر سے چلتے وقت اُس نے اپنی صورت دیکھی تھی اُسے چمکانے کے لئے جتنا صیقل کر سکتی تھی وہ کیا تھا۔ لیکن اب وہ صورت، جیسے یادداشت مٹ گئی ہے اس کی ایک دُھندلی سی پرچھائیں ذہن میں ہے۔ اُسے پھر سے دیکھنے کے لئے وہ بے قرار ہو رہی ہے۔ یوں تو اُس کے پاس میک اپ کے لوازمات کے ساتھ آئینہ بھی ہے۔ لیکن مجمع میں وہ آئینہ دیکھنے یا بناؤ سنگار کرنے کی عادی نہیں ہے۔ یہ عورتیں دل میں خدا جانے کیا سمجھیں۔ یہاں کوئی آئینہ تو ہوگا ہی۔

ڈرائنگ روم میں تو ضرور ہوگا وہ اُٹھ کر ڈرائنگ روم میں گئی اور قدآدم شیشہ میں اپنی صورت دیکھی۔ اس کے خدوخال بے عیب ہیں۔ مگر وہ تازگی وہ شگفتگی وہ تنظر فریبی نہیں ہے۔ ہاں نہیں ہے۔ رام دلاری آج کھلی ہے۔ اُسے کھلے زمانہ ہو گیا لیکن اس خیال سے اُسے تسکین نہیں ہوئی۔ وہ رام دلاری سے ہیٹی بن کر نہیں رہ سکتی۔ یہ مرد بھی کتنے احمق ہوتے ہیں۔ کسی میں اصل حسن کی پرکھ نہیں۔ اُنھیں تو جوانی اور شوخی اور نفاست چاہیئے۔ آنکھیں رکھ کر بھی اندھے بنتے ہیں۔ میرے کپڑوں میں رام دلاری کو کھڑا کر دو۔ پھر دیکھو یہ سارا جادو کہاں اُڑ جاتا ہے۔ چڑیل سی نظر آئے۔ ان احمقوں کو کون سمجھائے۔

رام دلاری کے گھر والے تو اتنے خوش حال نہ تھے۔ شادی میں جو جوڑے اور

اور زیور آئے تھے وہ بہت ہی دلشکن تھے۔ عمارت کا کوئی دوسرا سامان ہی نہ تھا۔ اس کے سسر ایک ریاست کے مختار تھے اور شوہر کالج میں پڑھتا تھا۔ اس دو سال میں کیسے ہُن برس گیا۔ کون جانے زیور کسی سے مانگ لائی ہو۔ کپڑے بھی دو چار دن کے لئے مانگ لئے ہوں۔ اسے یہ سوانگ مبارک رہے۔ میں جیسی ہوں ویسی ہی اچھی ہوں۔ اپنی حیثیت کو بڑھا کر دکھانے کا مرض کتنا بڑھتا جاتا ہے۔ گھر میں روٹیوں کا ٹھکانا نہیں ہے لیکن اس طرح بن ٹھن کر نکلیں گی گویا کہیں کی راجکماری ہیں۔ بساطیوں کے بزاز کے اور درزی کے تقاضے سہیں گی۔ شوہر کی گھرکیاں کھائیں گی، روئیں گی، روٹھیں گی مگر نمائش کے جنون کو نہیں روک سکتیں۔ گھر والے بھی سوچتے ہوں گے کتنی چھچھوری طبیعت ہے اس کی مگر یہاں تو بے وفائی پر کمر باندھ لی کوئی کتنا ہی ہنسے بے حیا کی بلا دُور۔ بس یہی دُھن سوار ہے کہ سج دھج سے نکل جائیں اُدھر اُس کی خوب تعریفیں کی جائیں۔ رام دلاری نے ضرور کسی سے زیور اور کپڑے مانگ لئے ہیں بے شرم جو ہے۔

اس کے چہرے پر غرور کی سرخی جھلک پڑی۔

نہ سہی اس کے پاس زیور اور کپڑے۔ کسی کے سامنے شرمندہ تو نہیں ہونا پڑتا۔ ایک ایک لاکھ کے تو اس کے دو لڑکے ہیں بھگوان انھیں زندہ اور سلامت رکھے۔ وہ اسی میں خوش ہے خود اچھا پہننے اور کھا لینے سے ہی زندگی کا مقصد پورا نہیں ہو جاتا۔ اس کے گھر والے غریب ہیں پر عزت تو ہے۔ کسی کا گلا تو نہیں دباتے۔ کسی کی بددعا تو نہیں لیتے۔

اس طرح اپنا دل مضبوط کر کے وہ پھر برآمدے میں آئی تو رام دلاری نے جیسے

رحم کی آنکھوں سے دیکھ کر کہا۔ جیجا جی کی کچھ ترقی وقی ہوئی کہ نہیں بہن، یا ابھی تک وہی پچھتر روپے پر قلم گھس رہے ہیں۔ روپ کماری کے بدن میں آگ سی لگ گئی۔ اونہہ رے دماغ گویا اس کا شوہر لاٹ ہی تو ہے۔ اکڑ کر بولی۔ ترقی کیوں نہیں ہوئی اب ستوا کے گریڈ میں ہیں۔ آج کل یہ بھی غنیمت ہے۔ میں تو اچھے اچھے ایم۔اے پاسوں کو دیکھتی ہوں کہ کوئی ٹکے کو نہیں پوچھتا۔ تیرا شوہر اب بی۔اے میں ہوگا؟

انھوں نے تو پڑھنا چھوڑ دیا بہن! پڑھ کر اوقات خراب کرنا تھا اور کیا ایک کمپنی کے ایجنٹ ہو گئے ہیں۔ اب ڈھائی سو روپے ماہوار پاتے ہیں۔ کمیشن اوپر سے پانچ روپے روز سفر خرچ کے بھی ملتے ہیں۔ یہ سمجھ لو کر پانچ سو کا اوسط پڑ جاتا ہے۔ ڈیڑھ سو روپے ماہوار تو ان کا ذاتی خرچ ہے بہن! اونچے عہدے پر ہیں تو اچھی حیثیت بھی بنائے رکھنی لازم ہے۔ ساڑھے تین سو روپے بے دارغ گھر نے دیتے ہیں۔ اس میں سو روپے مجھے ملتے ہیں۔ ڈھائی سو روپے میں گھر کا خرچ خوش فعلی سے چل جاتا ہے، ایم اے پاس کر کے کیا کرتے۔"

روپ کماری اسے شیخ چلی کی داستان سے زیادہ وقعت نہ دینا چاہتی تھی، مگر رام دلاری کے لہجے میں اتنی صداقت ہے کہ تحت الشعور میں وہ اس سے متاثر ہو رہی ہے اور اس کے چہرے پر خفت اور شکست کی بدمزگی صاف جھلک رہی ہے۔ مگر اُسے اپنے ہوش و حواس کو قائم رکھنا ہے تو اس اثر کو دل سے ہٹا دینا پڑے گا۔ اسے جرحوں سے اپنے دل کو یقین کرا دینا پڑے گا کہ اس میں ایک چوتھائی سے زیادہ حقیقت نہیں۔ وہاں تک وہ برداشت کرلے گی۔ اس سے زیادہ وہ کیسے برداشت کر سکتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی اس کے دل میں دھڑکن بھی ہے کہ کہیں یہ روداد سچ

نکلی تو وہ کیسے رام دلاری کو منہ دکھائے گی۔ اُسے اندیشہ ہے کہ کہیں اس کی آنکھوں سے آنسو نہ نکل پڑیں۔ کہاں پچھتر اور کہاں پانچ سو۔ اتنی بڑی رقم ضمیر کا خون کر کے بھی کیوں نہ ملے پھر بھی روپ کماری اس کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ ضمیر کی قیمت زیادہ سے زیادہ سو روپیہ ہو سکتی ہے، پانچ سو کسی حالت میں نہیں۔

اس نے تمسخر کے انداز سے پوچھا۔ "جب ایجنٹی میں اتنی تنخواہ اور بھتے ملتے ہیں تو کالج بند کیوں نہیں ہو جاتے ہزاروں لڑکے کیوں اپنی زندگی خراب کرتے ہیں۔"

رام دلاری بہن کی خفت کا مزہ اُٹھاتی ہوئی بولی۔ "بہن تم یہاں غلطی کر رہی ہو ایم۔ اے تو سب ہی پاس ہو سکتے ہیں مگر ایجنٹی کرنی کس کو آتی ہے۔ یہ خداداد ملکہ ہے۔ کوئی زندگی بھر پڑھتا رہے۔ مگر ضروری نہیں کہ وہ اچھا ایجنٹ ہو جائے۔ روپیہ پیدا کرنا دوسری چیز ہے۔ علمی فضیلت حاصل کرنا دوسری چیز ہے۔ اپنے مال کی خوبی کا یقین پیدا کرنا یہ ذہن نشین کرا دینا کہ اس سے ارزاں اور دیرپا چیز بازار میں مل ہی نہیں سکتی۔ آسان کام نہیں ہے۔ ایک سے ایک گاہکوں سے ان کا سابقہ پڑتا ہے۔ بڑے بڑے راجاؤں اور رئیسوں کی تالیفِ قلب کرنی پڑتی ہے۔ اوروں کی تو ان راجاؤں اور نوابوں کے سامنے جانے کی ہمت بھی نہ پڑے اور کسی طرح پہنچ جائیں تو زبان نہ نکلے۔ شروع شروع میں انھیں بھی جھجک ہوئی تھی۔ مگر اب تو اس دریا کے مگرمچھ ہیں۔ اگلے سال ترقی ہونے والی ہے۔"

روپ کماری کی رگوں میں جیسے خون کی حرکت بند ہوتی جا رہی ہے۔ ظالم آسمان کیوں نہیں گر پڑتا۔ بے رحم زمین کیوں نہیں پھٹ جاتی۔ یہ کہاں کا انصاف ہے کہ روپ کماری جو حسین ہے، تمیز دار ہے، کفایت شعار ہے، اپنے شوہر پر جان دیتی ہے۔ بچوں کو جان سے

زیادہ عزیز رکھتی ہے۔ اس کی اس خستہ حالی میں بسر ہو اور یہ بدتمیز، تن پرور، چنچل چھوکری رانی بن جائے۔ مگر اب بھی کچھ اُمید باقی تھی۔ شاید اس کی تسکینِ قلب کا کوئی راستہ نکل آئے۔

اسی تمسخر کے انداز سے بولی۔ "تب تو شاید ایک ہزار ملنے لگیں"۔ "ایک ہزار تو نہیں، مگر چھ سو میں شبہ نہیں۔" کوئی آنکھ کا اندھا مالک بن گیا ہوگا

"بیوپاری آنکھ کے اندھے نہیں ہوتے، جب تم انھیں چھ ہزار کما کر دو تب کہیں چھ سو ملیں۔ جو ساری دنیا کو چرائے اُسے کوئی کیا بیوقوف بنائے گا"۔

تمسخر سے کام چلتے نہ دیکھ کر روپ کماری نے تحقیر شروع کی۔ "میں تو اس کو بہت معزز پیشہ نہیں سمجھتی۔ سارے دن جھوٹ کے طومار باندھو یہ تو ٹھگ بدیا ہے"۔

رام دلاری زور سے ہنسی، روپ کماری پر اس نے کامل فتح پالی تھی۔ اُس طرح تو جتنے وکیل، بیرسٹر ہیں سب ہی ٹھگ بدیا کرتے ہیں۔ اپنے موکل کے فائدے کے لئے انھیں چھوٹی شہادتیں تک بنانی پڑتی ہیں مگر اُنہی وکیلوں کو ہم اپنا لیڈر کہتے ہیں۔ انھیں اپنی سبھاؤں کا صدر بناتے ہیں۔ ان کی گاڑیاں کھینچتے ہیں ان پر پھولوں کی اور زر و جواہر کی برکھا کرتے ہیں۔ آج کل دُنیا پیسہ دیکھتی ہے۔ پیسے کیسے آئے یہ کوئی نہیں دیکھتا جس کے پاس پیسہ ہو اس کی پوجا ہوتی ہے جو بدنصیب ہیں، ناقابل ہیں، پست ہمت ہیں۔ ضمیر اور اخلاق کی دہائی دے کر اپنے آنسو پونچھ لیتے ہیں ورنہ ضمیر اور اخلاق کو کون پوچھتا ہے۔

روپ کماری خاموش ہو گئی۔ اب اُسے یہ حقیقت اس کی ساری تلخیوں کے ساتھ تسلیم کرنی پڑے گی کہ رام دلاری اُس سے زیادہ خوش نصیب ہے اس سے مفر

نہیں۔ تمسخر یا تحقیر سے وہ اپنی تنگ دلی کے اظہار کے سوا اور کسی نتیجہ پر نہیں پہنچ سکتی۔ اُسے کسی بہانہ سے رام دلاری کے گھر جاکر اصلیت کی چھان بین کرنی پڑے گی اگر رام دلاری واقعی لکشمی کا بردان پا گئی ہے تو وہ اپنی قسمت ٹھونک کر بیٹھ رہے گی۔ سمجھ لے گی کہ دنیا میں کہیں انصاف نہیں ہے، کہیں ایمانداری کی قدر نہیں ہے۔

مگر کیا سچ مچ اس خیال سے اُسے تسکین ہو گی۔ یہاں کون ایمان دار ہے وہی جسے بے ایمانی کا موقع نہیں ہے اور اتنی ہمت ہے کہ وہ موقع پیدا کر لے۔ اُس کے شوہر پچھتر روپے ماہوار پاتے ہیں کیا دس بیس روپے اور اوپر سے مل جائیں تو وہ خوش ہو کر لے نہ لیں گے۔ ان کی ایمانداری اور اصول پروری اِس وقت تک ہے جب تک موقع نہیں ملتا۔ جس دن موقع ملا ساری اصول پروری دھری رہ جائے گی اور تب کیا روپ کماری میں اتنی اخلاقی قوت ہے کہ وہ اپنے شوہر کو ناجائز آمدنی سے روک دے؟ روکنا تو درکنار وہ خوش ہو گی۔ شاید اپنے شوہر کی پیٹھ ٹھونکے۔ ابھی اُن کے دفتر سے واپسی کے وقت من مارے بیٹھی رہتی ہے۔ تب دروازے پر کھڑی ہو کر ان کا انتظار کرے گی اور جونہی وہ گھر میں آئیں گے اُن کی جیبوں کی تلاشی لے گی۔

آنگن میں گانا بجانا ہو رہا تھا۔ رام دلاری اُمنگ کے ساتھ گا رہی تھی اور روپ کماری وہیں برآمدے میں اُداس بیٹھی ہوئی تھی۔ نہ جانے کیوں اس کے سر میں درد ہونے لگا تھا۔ کوئی گائے کوئی ناچے، اُسے کوئی سروکار نہیں۔ وہ تو بدنصیب ہے رونے کے لئے پیدا کی گئی ہے۔

نو بجے رات کے مہمان رخصت ہونے لگے۔ روپ کماری بھی اُٹھی یکہ منگوانے

جارہی تھی کہ رام دلاری نے کہا۔ "یکہ منگوا کر کیا کرو گی بہن، مجھے لینے کے لئے ابھی کار آتی ہو گی۔ دو چار دن میرے یہاں رہو، پھر چلی جانا۔ میں جیجا جی کو کہلا بھیجوں گی۔"

روپ کماری کا آخری حربہ بھی بیکار ہو گیا۔ رام دلاری کے گھر جا کر دریافت حال کی خواہش یکایک فنا ہو گئی۔ وہ اب اپنے گھر جائے گی اور منہ ڈھانپ کر پڑ رہے گی۔ ان پھٹے حالوں کیوں کسی کے گھر جائے۔ بولی "بہن ابھی تو مجھے فرصت نہیں ہے، پھر کبھی آؤں گی۔"

"کیا رات بھر بھی نہ ٹھہرو گی؟" — "نہیں میرے سر میں زور سے درد ہو رہا ہے۔"

"اچھا بتاؤ کب آؤ گی۔ میں سواری بھیج دوں گی۔"

"میں خود کہلا بھیجوں گی۔"

"تمہیں یاد نہ رہے گا۔ سال بھر ہو گیا۔ بھول کر بھی یاد نہ کیا۔ میں اسی انتظار میں تھی کہ دیدی بلائیں تو چلوں۔ ایک ہی شہر میں رہتے ہیں پھر بھی اتنی دور کہ سال سال بھر گزر جائے اور ملاقات نہ ہو۔"

گھر کی فکروں سے فرصت ہی نہیں ملتی، کئی بار ارادہ کیا کہ تجھے بلا بھیجوں مگر موقعہ ہی نہ ملا۔ اتنے میں رام دلاری کے شوہر مسٹر گردسیوک نے آکر بڑی سالی کو سلام کیا۔ بالکل انگریزی وضع تھی۔ کلائی پر سونے کی گھڑی، آنکھوں پر سنہری عینک بالکل اسٹوڈیٹ جیسے کوئی تازہ وارد سولیین ہو۔ چہرے سے ذہانت متانت اور شرافت برس رہی تھی۔ وہ اتنا خوبرو اور جامہ زیب ہے، روپ کماری کو کبھی گمان بھی نہ تھا۔

دعا دے کر بولی۔ "آج یہاں نہ آتی تو تم سے ملاقات کیوں ہوتی۔"

گردسیوک ہنس کر بولا۔ "بجا فرماتی ہیں، اُلٹی شکایت کبھی آپ نے بلایا اور

میں نہ گیا۔"

"میں نہیں جانتی تھی کہ تم اپنے کو مہمان سمجھتے ہو وہ بھی تمہارا ہی گھر ہے۔"

"اب مان گیا بھابی صاحب، بے شک میری غلطی ہے، انشاء اللہ اس کی تلافی کردوں گا، مگر آج ہمارے گھر رہیئے۔"

"نہیں آج بالکل فرصت نہیں ہے۔ پھر آؤں گی۔ لڑکے گھر پر گھبرا رہے ہوں گے۔"

رام دلاری بولی "میں کتنا کہہ کے ہار گئی مانتی ہی نہیں۔"

دونوں بہنیں کار کی پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئیں۔ گردسیوک ڈرائیو کرتا ہوا چلا۔ ذرا دیر میں اس کا مکان آ گیا۔ رام دلاری نے پھر روپ کماری سے چلنے کے لئے اصرار کیا مگر وہ نہ مانی۔ لڑکے گھبرا رہے ہوں گے۔ آخر رام دلاری اُس سے گلے مل کر اندر چلی گئی۔ گردسیوک نے کار بڑھائی۔ روپ کماری نے اُڑتی ہوئی نگاہ سے رام دلاری کا مکان دیکھا اور وہ ٹھوس حقیقت سلاخ کی طرح اُس کے جگر میں چبھ گئی۔ کچھ دُور چل کر گردسیوک بولا "بھابی میں نے اپنے لئے کیسا اچھا راستہ نکال لیا۔ اگر دو چار سال کام چل گیا تو آدمی بن جاؤں گا۔"

روپ کماری نے ہمدردانہ لہجہ میں کہا۔ "رام دلاری نے مجھ سے کہا بھگوان کرے جہاں رہو خوش رہو۔ خدا ہاتھ پیر سنبھال کر رہنا۔"

"میں مالک کی آنکھ بچا کر ایک پیسہ لینا بھی گناہ سمجھتا ہوں۔ دولت کا مزہ جب ہے کہ ایمان سلامت رہے۔ ایمان کھو کے پیسے ملے تو کیا۔ میں ایسی دولت پر لعنت بھیجتا ہوں اور آنکھ کس کی بچاؤں سب سیاہ و سفید تو میرے ہاتھ میں ہے مالک تو کوئی ہے نہیں اس کی بیوہ ہے۔ اس نے سب کچھ میرے ہاتھ میں چھوڑ رکھا ہے

میں نے اس کا کاروبار نہ سنبھال لیا ہوتا تو سب کچھ چوپٹ ہو جاتا۔ میرے سامنے تو مالک صرف تین مہینے زندہ رہے مگر بڑا مردم شناس آدمی تھا۔ مجھے سو روپے پر رکھا اور ایک ہی مہینے میں ڈھائی سو کر دیئے۔ آپ کی دعا سے پہلے ہی مہینے میں میں نے بارہ ہزار کا کام کیا۔"

"کام کیا کرنا پڑتا ہے؟"

"وہی مشینوں کی ایجنٹی، طرح طرح کی مشینیں منگانا اور بیچنا۔"

روپ کماری کا منحوس گھر آگیا۔ دروازے پر ایک لالٹین ٹمٹما رہی تھی اس کے شوہر بابو امانا تھ دروازے پر ٹہل رہے تھے۔ روپ کماری اُتری مگر اس نے گرو سیوک سے آنے کے لئے اصرار نہ کیا۔ بے دلی سے کہا ضرور مگر زور نہ دیا، اور امانا تھ تو مخاطب ہی نہ ہوئے۔

روپ کماری کو وہ گھر اب قبرستان سا لگ رہا تھا۔ جیسے پھوٹا ہوا نصیب ہو۔ نہ کہیں فرش نہ فرنیچر نہ گھلے۔ دو چار ٹوٹی ٹاٹی کرسیاں، ایک لنگڑی میز، چار پانچ پرانی دھرانی کھاٹیں، یہی اس گھر کی بساط تھی۔ آج صبح تک روپ کماری اس گھر میں خوش تھی لیکن اب اس گھر سے اسے مطلق دلچسپی نہ رہی۔ لڑکے اماں اماں کر کے دوڑے مگر اس نے دونوں کو جھڑک دیا، سر میں درد ہے وہ کسی سے نہ بولے گی۔ ابھی تک کھانا نہیں پکا۔ پکاتا کون؟ لڑکوں نے تو دودھ پی لیا ہے مگر امانا تھ نے کچھ نہیں کھایا۔ اسی انتظار میں تھے کہ روپ کماری آئے تو پکائے مگر روپ کماری کے سر میں درد ہے مجبوراً بازار سے پوریاں لانی پڑیں گی۔

روپ کماری نے ملامت آمیز انداز سے کہا "تم اب تک میرا انتظار کیوں کرتے رہے میں نے کھانا پکانے کا ٹھیکہ تو نہیں لیا ہے اور جو رات بھر میں وہیں رہ جاتی؟ آخر تم

ایک مہراجن کیوں نہیں رکھ لیتے یا زندگی بھر مجھی کو پیتے رہو گے۔"

امانا تھ نے اس کی طرف مظلوم اور پُرسوال حیرت کی نگاہ ڈالی۔ اس کی برہمی کا کوئی سبب ان کی سمجھ میں نہ آیا۔ روپ کاری سے اُنھوں نے ہمیشہ بے عُذر اطاعت پائی ہے، بے عُذر ہی نہیں خوش دلانہ بھی۔ انھوں نے کئی بار مہراجن رکھ لینے کی تجویز اور خواہش کی تھی۔ مگر اس نے ہمیشہ یہی کہا کہ آخر میں بیٹھے بیٹھے کیا کروں گی۔ چار پانچ روپیہ کا خرچ بڑھانے سے کیا فائدہ۔ یہ رقم بچ رہے گی تو بچوں کے لیے مکھن آجائے گا اور آج وہ اتنی بے دردی سے شکایت کر رہی ہے جیسے غصہ میں بھری ہو۔

اپنی صفائی پیش کرتے ہوئے بولے "مہراجن رکھنے کے لیے میں نے تم سے کئی بار کہا"

"تو لا کیوں نہ دیا۔ میں اُسے نکال دیتی تو کہتے"

"ہاں یہ غلطی ہوئی"

"تم نے کبھی سچے دل سے کہا، محض مہراجن لینے کے لیے کہا، تمہارے دل میں کبھی میرے آرام کا خیال آیا ہی نہیں۔ تم خوش تھے کہ اچھی لونڈی مل گئی۔ ایک روٹی کھاتی ہے اور چپ چاپ پڑی ہے۔ اتنی سستی لونڈی اور کہاں ملتی۔ محض کپڑے اور کھانے پر وہ جب گھر بھر کی ضرورتوں سے بچے۔ پچھتر روپلیاں لاکر میرے ہاتھ پر رکھ دیتے ہو اور ساری دنیا کا خرچ۔ میرا دل ہی جانتا ہے مجھے کتنی کتر بیونت کرنی پڑتی ہے۔ کیا پہنوں اور کیا اوڑھوں، تمہارے ساتھ زندگی خراب ہوگئی۔ وہ مرد بھی ہوتے ہیں جو بیویوں کے لیے آسمان کے تارے توڑ لاتے ہیں۔ گردسیوک ہی کو دیکھو تم سے کم پڑھا ہے، عمر میں تم سے کہیں کم ہے مگر پانچسو روپیہ مہینہ لاتا ہے اور رام دلاری رانی بنی بیٹھی رہتی ہے۔ تمہارے لیے یہ ہی پچھتر بہت ہیں رانڈ ماندہ میں ہی خوش تم ناحق مرد ہوئے، تمہیں تو عورت ہونا

چاہیے تھا۔ اوروں کے دل میں کیسے کیسے ارمان ہوتے ہیں۔ مگر میں تو تمہارے لیے گھر کی مرغی باسی ساگ ہوں تمہیں تو کوئی تکلیف ہوتی نہیں تمہیں تو کپڑے بھی اچھے چاہییں کھانا بھی اچھا چاہیے، کیونکہ تم مرد ہو۔ باہر سے کما کر لاتے ہو میں چاہے جیسے رہوں تمہاری بلا سے ......"

یہ سلسلہ کئی منٹ تک جاری ہے اور بیچارے اماناتھ خاموش سنتے رہے۔ اپنی دانست میں انھوں نے روپ کماری کو شکایت کا کوئی موقعہ نہیں دیا۔ ان کی تنخواہ کم ہے ضرور یہ ان کے بس کی بات تو نہیں۔ وہ دل لگا کر اپنا کام کرتے ہیں۔ افسروں کو خوش رکھنے کی ہمیشہ کوشش کرتے ہیں۔ اس سال بڑے بابو کے چھوٹے صاحبزادے کو چھ مہینے تک بلاناغہ پڑھایا۔ اسی لیے کہ وہ خوش رہیں۔ اب اور کیا کریں۔ روپ کماری برہمی کا راز تو انہیں معلوم ہوگیا۔ اگر گردسیوک واقعی پانچسو روپیہ لاتا ہے تو بے شک خوش نصیب ہے۔ لیکن دوسروں کی اونچی پیشانی دیکھ کر اپنا ماتھا تو نہیں پھوڑا جاتا اُسے یہ موقعہ مل گیا۔ دوسروں کو ایسے موقعے کہاں ملتے ہیں۔ وہ تحقیق کریں گے کہ واقعی اُسے پانچسو ملتے ہیں یا محض گپ ہے اور بالفرض ملتے ہوں تو اس سے کیا روپ کماری کو یہ حق ہے کہ وہ اُنہیں نشانہ ملامت بنائے اور اگر اسی طرح وہ روپ کماری سے زیادہ حسین زیادہ خوش سلیقہ عورت دیکھ کر اُسے کوسنا شروع کردیں تو کیسا ہو۔ روپ کماری حسین ہے۔ شیریں زبان ہے خوش مذاق ہے۔ بے شک لیکن اس سے زیادہ حسین، زیادہ شیریں زیادہ خوش مذاق عورت دنیا میں معدوم نہیں ہے، ایک زمانہ تھا جب ان کی نظروں میں روپ کماری سے زیادہ حسین عورت دنیا میں نہ تھی۔ لیکن وہ جنون اب باقی نہیں رہا۔ جذبات کی دنیا سے حقیقت کی دنیا میں آئے اُنہیں ایک ایک مدت گزر گئی اب تو

برقی کتب کی دنیا میں خوش آمدید

آپ ہمارے کتابی سلسلے کا حصہ بن سکتے ہیں

مزید اس طرح کی شان دار، مفید اور نایاب کتب

کے حصول کے لیے ہمارے واٹس ایپ گروپ کو

جوائن کریں

ایڈمن پینل :

محمد ثاقب ریاض: 03447227224

سدرہ طاہر: 03340120123

حسنین سیالوی: 03056406067

Imagitor

انہیں ازدواجی زندگی کا کافی تجربہ ہے، ایک دوسرے کے عیب و ہنر معلوم ہو گئے ہیں۔ اب تو صابر و شاکر رہ کر ہی ان کی زندگی عافیت سے کٹ سکتی ہے روپ کماری اتنی موٹی سی بات بھی نہیں سمجھتی۔

پھر بھی انہیں روپ کماری سے ہمدردی ہوئی۔ اس کی سخت کلامیوں کا انھوں نے کچھ جواب نہ دیا، شربت کی طرح پی گئے۔ اپنی بہن کا ٹھاٹ دیکھ کر ایک لمحہ کے لیے روپ کماری کے دل میں ایسے دل شکن، مایوس کن، غیر منصفانہ خیالات کا پیدا ہونا بالکل فطری ہے۔ وہ کوئی فلاسفر نہیں، تارک الدنیا نہیں کہ ہر حال میں اپنی طبعی سکون کو قائم رکھے۔ اس طرح اپنے دل کو سمجھا کر امانا تھ دریافت حال کی مہم کے لیے آمادہ ہو گئے

(۲)

ایک ہفتہ تک روپ کماری ہیجان کی حالت میں رہی۔ بات بات پر جھنجھلاتی، لڑکوں کو ڈانٹتی، شوہر کو کوستی، اپنی تقدیر کو روتی، گھر کا کام تو کرنا ہی پڑتا تھا۔ ورنہ نئی آفت آجاتی۔ لیکن اب کسی کام سے اُسے دلچسپی نہ تھی گھر کی جن پرانی دھرانی چیزوں سے اُسے دلی تعلق ہو گیا تھا جن کی صفائی اور سجاوٹ میں وہ منہمک رہا کرتی تھی ان کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھتی۔ گھر میں ایک ہی خدمت گار تھا۔ اس نے جب دیکھا بہو جی گھر کی طرف سے خود ہی لاپروا ہیں تو اُسے کیا غرض تھی کہ صفائی کرتا۔ دونوں بچے بھی ماں سے بولتے ڈرتے تھے اور امانا تھ تو اس کے سائے سے بھاگتے تھے جو کچھ سامنے آجاتا زہر مار کر لیتے اور دفتر چلے جاتے۔ دفتر سے لوٹ کر دونوں بچوں کو ساتھ لے لیتے اور کہیں گھومنے نکل جاتے روپ کماری سے کچھ بولتے روح فنا ہوتی تھی۔ ہاں ان کی تفتیش جاری تھی۔

ایک دن اماناتھ دفتر سے لوٹے تو ان کے ساتھ گردسیوک بھی تھے۔ روپ کماری نے آج کئی دن کے بعد زمانے سے مصالحت کر لی تھی اور اس وقت جھاڑن لیے کرسیاں اور تپائیاں صاف کر رہی تھی کہ گردسیوک نے اسے اندر پہنچ کر سلام کیا۔ روپ کماری دل میں کٹ گئی۔ اماناتھ پر غصہ بے حد آیا۔ انہیں لاکر یہاں کیوں کھڑا کر دیا نہ کہنا نہ سننا بس بلا لائے۔ اُسے اس حالت میں دیکھ کر گردسیوک نے دل میں کیا سمجھا ہوگا۔ مگر انہیں عقل آئی ہی کب تھی۔ وہ اپنا پردہ ڈھانکتی پھرتی ہے اور آپ سے کھولتے پھرتے ہیں۔ ذرا بھی شرم نہیں۔ جیسے بے حیائی کا جامہ پہن لیا ہے! خواہ مخواہ اسے ذلیل کرتے ہیں

دعا دے کر عافیت پوچھی اور کرسی رکھ دی۔ گردسیوک نے بیٹھتے ہوئے کہا آج بھابی صاحبہ نے میری دعوت کی ہے۔ میں ان کی دعوت پر تو نہ آتا۔ لیکن انھوں نے کہا کہ تمہاری بھابی کا سخت تقاضہ ہے۔ تب مجھے وقت نکالنا پڑا۔

روپ کماری نے بات بنائی "تم سے اس دن رواروی میں ملاقات ہوئی دیکھنے کو جی لگا ہوا تھا"

گردسیوک نے در و دیوار پر نظر ڈال کر کہا "اس پنجرے میں تو آپ لوگوں کو بڑی تکلیف ہوتی ہوگی"۔

روپ کماری کو اب معلوم ہوا کہ یہ کتنا بد مذاق ہے۔ دوسروں کے جذبات کی اسے بالکل پروا نہیں یہ اتنی سی بات بھی نہیں سمجھتا کہ دنیا میں سبھی تقدیر والے نہیں ہوتے لاکھوں میں کہیں ایک ایسا ہی بھگوان نکلتا ہے۔ کسی قدر ترش ہو کر بولی "پنجرے میں رہنا کنگھرے میں رہنے سے اچھا ہے۔ پنجرے میں معصوم چڑیاں رہتی ہیں کنگھر تو درندوں کا مسکن ہے"

گردسیوک کنایہ نہ سمجھ سکا بولا مجھے تو اس گھر میں حبس ہو جائے دم گھٹ جائے میں آپ کے لیے اپنے گھر کے پاس ایک گھر لے کر دوں گا۔ خوب لمبا چوڑا آپ سے کچھ کرایہ نہ لیا جائے گا۔ مکان ہماری مالکن کا ہے۔ میں بھی تو اسی کے مکان میں رہتا ہوں۔ سینکڑوں مکان ہیں۔ اس کے پاس سینکڑوں۔ سب میرے اختیار میں ہیں۔ جس کو جو مکان چاہے دے دوں۔ میرے اختیار میں ہے کرایہ لوں یا نہ لوں میں آپ کے لیے اچھا سا مکان ٹھیک کر دوں گا۔ جو سب سے اچھا ہے، میں آپ کا بہت ادب کرتا ہوں....."

روپ کماری سمجھ گئی، حضرت اس وقت نشے میں ہیں جب ہی بہکی بہکی باتیں کر رہے ہیں۔ ان کی آنکھیں سکڑ گئیں۔ رخسار کچھ پھول گئے تھے۔ زبان میں ہلکی سی لغزش تھی جو ہر لمحہ نمایاں ہو جاتی تھی۔ ایک جوان، خوبصورت، شریف چہرہ رکیک اور بے غیرت بن گیا تھا۔ جسے دیکھ کر نفرت ہوئی تھی۔

اس نے ایک لمحہ بعد پھر بہکنا شروع کیا۔ میں آپ کا بہت ادب کرتا ہوں آپ میری بڑی بھابی ہیں۔ آپ کے لیے میری جان حاضر ہے آپ کے لیے مکان کا انتظام کرنا میرے لیے مشکل نہیں ہے۔ میں مسز لوہیا کا مختار ہوں۔ سب کچھ میرے اختیار میں ہے۔ سب کچھ میں جو کچھ کہتا ہوں وہ آنکھیں بند کر کے منظور کر لیتی ہے۔ مجھے اپنا بیٹا سمجھتی ہے۔ میں اس کی ساری جائیداد کا مالک ہوں۔ مسٹر لوہیا نے مجھے بیس روپے کا نوکر رکھا تھا۔ بڑا مالدار آدمی تھا۔ مگر یہ کسی کو معلوم نہیں اس کی دولت کہاں سے آتی تھی کسی کو معلوم نہیں۔ میرے سوا کوئی جانتا نہیں وہ خفیہ فروش تھا کسی سے کہنا نہیں وہ خفیہ فروش تھا کوکین بیچتا تھا۔ لاکھوں کی آمدنی تھی اس کی میں اب بھی وہی کام کرتا ہوں ہر شہر میں ہمارے ایجنٹ ہیں۔ مسٹر لوہیا نے مجھے اس فن میں یکتا کر دیا۔ جی ہاں۔ مجال

نہیں کہ کوئی مجھے گرفتار کرلے۔ بڑے بڑے افسروں سے میرا یارانہ ہے۔ ان کے منہ میں نوٹوں کے پلندے ٹھونس کران کی آواز بند کردیتا ہوں۔ کوئی چوں نہیں کرسکتا حساب میں لکھتا ہوں ایک ہزار دیتا ہوں، پانچسو، باقی یاروں کا ہے۔ بے دریغ روپے آتے ہیں اور بے دریغ خرچ کرتا ہوں۔ بڑھیا کو تو رام نام سے مطلب ہے۔ سادھوں سنتوں کی سیوائیں لگی رہتی ہے اور بندہ چین کرتا ہے۔ جتنا چاہوں خرچ کروں کوئی ہاتھ پکڑنے والا نہیں کوئی بولنے والا نہیں (جیب سے نوٹوں کا ایک بنڈل نکال کر) یہ آپ کے قدموں کا صدقہ ہے۔ مجھے دعا دیجئے جو ایمان اور اصول کے اپاسک ہیں انہیں دولت لات مارتی ہے۔ دولت تو انہیں پکڑتی ہے جو اس کے لیے اپنا دین وایمان سب کچھ نثار کرنے کو تیار ہیں۔ مجھے بُرا نہ کہیے۔ جتنے دولت مند ہیں سب لیٹرے ہیں، میں بھی انہیں میں ایک ہوں کل میرے پاس روپے ہو جائیں اور میں ایک دھرم سالہ بنوا دوں پھر دیکھیے میری کتنی واہ واہ ہوتی ہے۔ کون پوچھتا ہے، مجھے یہ دولت کہاں سے ملی ایک وکیل ایک گھنٹہ بھر بحث کرکے ایک ہزار سیدھا کرلینا۔ ایک ڈاکٹر ذرا سا نشتر لگا کر پانچسو روپے مار لینا ہے۔ اگر ان کی آمدنی جائز ہے تو میری آمدنی بھی جائز ہے۔ ضرورت مندوں کو لوٹ کر مالدار ہو جانا ہماری سوسائٹی کا پرانا دستور ہے۔ میں بھی وہی کرتا ہوں جو دوسرے کرتے ہیں۔ زندگی کا مقصد ہے عیش کرنا۔ میں بھی لوٹوں گا۔ عیش کروں گا عیش کروں گا اور خیرات کروں گا اور ایک دن لیڈر بن جاؤں گا۔ کیسے گنوا دوں یہاں کتنے لوگ جوا کھیل کر کروڑ پتی ہو گئے، کتنے عورتوں کا بازار لگا کر کروڑ پتی ہو گئے...

...... امانا تھ نے آکر کہا "گردسیوک کیا کر رہے ہو۔ چلو چائے پی لو ٹھنڈی ہو رہی ہے۔" گردسیوک اٹھا پیر لڑکھڑائے اور زمین پر گر پڑا۔ پھر سنبھل کر اٹھا اور جھومتا جھامتا

ٹھوکریں کھاتا باہر چلا گیا۔ روپ کماری نے — آزادی کا سانس لیا۔ یہاں بیٹھے بیٹھے اس کا دم گھٹ رہا تھا۔ کمرے کی ہوا جیسے بھاری ہو گئی تھی۔ جو ترغیبیں کئی دن سے اچھے اچھے دلادیز روپ بھر کر اس کے سامنے آ رہی تھیں آج اسے ان کی اصلی مکروہ گھناؤنی صورت نظر آئی۔ جس سادگی اور خلوص اور ایثار کی فضا میں اب تک زندگی گزاری تھی اس پر حرامکاری اور آبلہ فریبی کا گزر نہ تھا۔ ان داموں وہ دنیا کی ساری دولت اور سارا عیش بھی خریدنے کو آمادہ نہ ہو سکتی تھی۔ اب وہ رام دلاری کی تقدیر سے اپنی تقدیر کا بدلا نہ کرے گی۔ وہ اپنے حال میں خوش ہے۔ رام دلاری پر اُسے رحم آیا۔ جو نمود و نمائش کے لیے اپنے ضمیر کا خون کر رہی ہے مگر ایک لمحہ میں گردسیوک کا دل نرم پڑ گیا۔ جس سوسائٹی میں دولت پُجتی ہے، جہاں انسان کی قیمت اس کے بنک اکاونٹ اور شان و شوکت سے ان کی جاتی ہے، جہاں قدم قدم پر ترغیبوں کا جال بچھا ہوا ہے اور سوسائٹی کا نظام اتنا بے ڈھنگا ہے کہ انسان میں حسد اور غضب اور فرد مائیگی کے جذبات کو اکساتا رہتا ہے۔ وہاں گردسیوک اگر رو میں بہ جائے تو تعجب کا مقام نہیں۔

اس وقت امانا تھ نے آکر کہا۔ "یہاں بیٹھا بیٹھا کیا بک رہا تھا؟ میں نے تو اُسے رخصت کر دیا۔ جی ڈرتا تھا کہیں اُس کے پیچھے پولیس لگی ہو۔ کہیں میں ناکردہ گناہ پکڑا جاؤں"

روپ کماری نے اس کی طرف معذرت خواہانہ نظر سے دیکھ کر جواب دیا "وہی اپنی خفیہ فردشی کا ذکر کر رہا تھا"

"مجھے بھی مسز لوہیا سے ملنے کی دعوت دے گیا ہے۔ شاید کوئی اچھی جگہ مل جائے"

"جی نہیں! آپ اپنی کلرکی کیے جائیے اسی میں آپ کی خیریت ہے"

"مگر کلرکی میں عیش کہاں؟ کیوں نہ سال بھر کی رخصت لے کر ذرا ادھر کا بھی لطف اٹھاؤں"

"مجھے اب وہ ہوس نہیں رہی"

"تم سے اگر یہ قصہ کہتا تو تمہیں یقین نہ آتا"

"ہاں یقین تو نہ آتا۔ میں تو قیاس ہی نہیں کر سکتی کہ اپنے فائدے کے لیے کوئی آدمی دنیا کو زہر کھلا سکتا ہے۔"

"مجھے سارا قصہ معلوم ہو گیا تھا۔ میں نے اُسے خوب شراب پلا دی تھی کہ نشہ میں بہکے گا ضرور سب کچھ خود قبول جائے گا۔"

"للچائی تو تمہاری طبیعت بھی تھی۔"

"ہاں للچائی تو ہے مگر عیب کرنے کے لیے جس ہُنر کی ضرورت ہے وہ کہاں سے لاؤں گا"

"ایشور نہ کرے وہ ہُنر تم میں آئے۔ مجھے اس بچارے پر ترس آتا ہے۔ معلوم نہیں رات میں اس پر کیا گزری؟"

"نہیں وہ تو اپنی کار پر تھے۔"

روپ کماری ایک منٹ تک زمین کی طرف دیکھتی رہی پھر بولی "تم مجھے دلاری کے گھر پہنچا دو۔ ابھی شاید میں اس کی مدد کر سکوں جس باغ کی وہ سیر کر رہی ہے اس کے چاروں طرف درندے گھات لگائے بیٹھے ہوئے ہیں۔ شاید میں اُسے بچا سکوں۔"

لاٹری

جلدی سے مالدار بن جانے کی ہوس کسے نہیں ہوتی، ان دنوں جب فرنچ لاٹری کے ٹکٹ آئے تو میرے عزیز دوست بکرم سنگھ کے والد، چچا، بھائی، ماں سبھی نے ایک ایک ٹکٹ خرید لیا۔ کون جانے کس کی تقدیر زور کرے، روپے رہیں گے تو گھر میں ہی کسی کے نام سے آجائیں۔

مجھے بھی اپنی تقدیر آزمانے کی سُوجھی، اس وقت تک زندگی کا مجھے جو تھوڑا بہت تجربہ ہوا تھا۔ وہ تو بہت ہمت افزا نہ تھا لیکن بھئی تقدیر کا حال کون جانے گاہ باشد کہ کودکِ ناداں رایک بار اپنی تقدیر آزمانے کو دل بے تاب ہو گیا اور بکرم بھی دوسروں کا دست نگر نہ بننا چاہتا تھا جس کے نام روپے آئیں گے وہ خود موج اڑالے گا اسے کون پوچھتا ہے بہت ہو گا۔ دس پانچ ہزار اس کے حصے میں آجائیں گے مگر اس سے کیا ہو گا اس کی زندگی میں بڑے بڑے منصوبے تھے پہلے تو اسے ساری دنیا کی سیاحت

کرنی تھی ایک ایک کونے کی۔ عام سیاحوں کی طرح نہیں، کہ تین ہفتہ میں ساری دنیا میں آندھی کی طرح اڑ کر گھر آ پہنچے، وہ ایک خطہ میں کافی عرصہ تک رہ کر وہاں کے باشندوں کی معاشرت کا مطالعہ کرنا چاہتا تھا، پیرو، برازیل، مڈغاسکر اور ابی سینیا یہ سبھی دشوار گزار خطے اس پروگرام میں تھے۔ پھر اسے ایک بہت بڑا کتب خانہ تعمیر کرانا تھا جس میں ساری دنیا کی کتابیں رکھی جائیں۔ اس کے لیے وہ دو لاکھ تک صرف کرنے کو تیار تھا۔ والد یا چچا کے ہاتھ روپے آئے تو شاید دو چار ہزار مل جائیں، بڑے بھائی کے نام پڑے تو دھیلا بھی نہ ملے گا ہاں اماں کے ہاتھ آئے تو بیس ہزار یقینی ہیں۔ مگر اس سے کہیں پیاس بجھتی ہے منصوبے تو اتنے اونچے تھے لیکن روپے نہ ان کے پاس تھے نہ میرے گھر میں روپے ملنے کی اسے امید نہ تھی ممکن تھا بہت ضد کرتا تو مل بھی جاتے مگر وہ اس امر کو پوشیدہ رکھنا چاہتا تھا۔

میرے پاس بھی روپے نہ تھے میں اسکول میں ماسٹر تھا، بیس روپے ملتے تھے، دس گھر بھیج دیتا تھا دس میں شٹم پشٹم اپنا گزر کرتا تھا ایسی حالت میں پانچ روپے کے ٹکٹ خریدنا میرے لیے مشکل ہی نہیں محال تھا۔

بکرم نے کہا کہو تو میں اپنی انگوٹھی بیچ دوں، کہہ دوں گا انگلی سے پھسل پڑی۔ میں نے منع کیا نہیں چوری فوراً کھل جائے گی اور مفت شرمندگی ہوگی ایسا کام کیوں کرو کہ بعد کو خفت ہو یہ تجویز ہوئی کہ ہم اپنی اپنی پرانی کتابیں کسی سکینڈ ہینڈ کتابوں کے دوکاندار کے ہاتھ بیچ ڈالیں، اور اس روپے سے ٹکٹ خریدیں۔ ہم دونوں کے پاس سکول کی کتابیں ارتھمیٹک، الجبرا، جیامٹری، جاگرفی موجود تھیں، میں تو ماسٹر تھا کسی بک سیلر کی دوکان پر جاتے جھینپتا تھا، قریب قریب سبھی مجھے پہچانتے تھے۔

اس لئے یہ خدمت بکرم کے سپرد ہوئی اور وہ آدھ گھنٹہ میں پانچ روپے کا ایک نوٹ لے کر آگیا۔ کتابیں پچیس سے کم کی نہ تھیں۔ مگر یہ پانچ اس وقت ہمارے لیے پانچ ہزار کے برابر تھے، فیصلہ ہوگیا ہم دونوں ساجھے میں ایک ٹکٹ لیں گے آدھا میرا ہوگا' آدھا بکرم کا۔ دس لاکھ میں پانچ لاکھ میرے حصّہ میں آئیں گے، پانچ لاکھ بکرم کے، ہم اپنے اسی میں خوش تھے۔ ہاں بکرم کو اپنی سیاحت والی اسکیم میں کچھ ترمیم کرنی پڑی۔ کتب خانہ کی تجویز میں کسی قسم کی قطع و برید ناممکن تھی یہ بکرم کی زندگی کا مقصدِ اولیٰ تھا۔

مَیں نے اعتراض کیا، یہ لازمی نہیں کہ تمہارا کتب خانہ شہر میں سب سے زیادہ شاندار ہو۔ ایک لاکھ بھی کچھ کم نہیں ہوتا۔

بکرم مشتعل تھا، ہرگز نہیں، کتب خانہ تو شہر میں لاثانی ہوگا۔ کیوں تم کچھ مدد نہ کروگے۔

مَیں نے اپنی مجبوری کا اظہار کیا۔ بھئی میری ضرورتیں مقابلتاً کہیں زیادہ ہیں۔ تمہارے گھر میں کافی جائیداد موجود ہے۔ والدین بھی زندہ ہیں۔ کسی قسم کا بار تمہارے اوپر نہیں میرے سر پر تو ساری گرہستی کا بوجھ ہے۔ دو بہنوں کی شادیاں ہیں، دو بھائیوں کی تعلیم ہے، نیا مکان بنوانا ہی پڑے گا، میں تو ایسا انتظام کروں گا کہ سارے مصارف سود سے نکل آئے۔ اور اصل میں داغ نہ لگنے پائے، کچھ ایسی قیدیں لگا دوں گا کہ میرے بعد کوئی اصل کو نہ نکال سکے۔

"تم نے سوچی تو بہت دور کی ہے لیکن بینکوں کا شرح سود بہت گرا ہوا ہے۔ پانچ لاکھ کی رقم بھی تو کم نہیں اگر پانچ فی صدی بھی ملے ۲۵ ہزار سالانہ ہوتے، تھوڑے ہیں"

ہم نے کئی بینکوں کا شرح سود دیکھا واقعی بہت کم تھا سوچا کیوں نہ لین دین کا

کاروبار شروع کر دیا جائے۔ بکرم اور میں دونوں کی مشترکہ کمپنی ہو۔ لین دین میں سود بھی اچھا ملے گا اور اپنا رعب داب بھی رہے گا۔ اچھے اچھے گھٹنے ٹیکیں گے۔ ہاں جب تک اچھی جائداد نہ ہو کسی کو روپیہ نہ دیا جائے، چاہے کتنا ہی معتبر آسامی ہو، مجبوری معتبروں کو بھی غیر معتبر بنا دیتی ہے، جائداد کی کفالت پر رہن نامہ لکھ کر روپیہ دینے میں کوئی اندیشہ نہیں رہتا روپے نہ وصول ہوں تو جائیداد تو مل ہی جاتی ہے۔

مگر لاٹری کے ٹکٹ پر دو نام نہیں رہ سکتے، کس کا نام دیا جائے۔

بکرم نے کہا میرا نام رہے گا۔

"کیوں میرا کیوں نہ رہے"

"تمہارا ہی نام سہی لیکن میری بہت دل شکنی ہوگی اگر روپے مل گئے تو میں گھر والوں پر بم گولا چھوڑوں گا اور لوگوں کو خوب چڑاؤں گا، بالکل طفلانہ خواہش ہے"

میں مجبور ہو گیا، بکرم کے نام سے ٹکٹ لیا گیا۔

(۲)

ایک ایک کر کے انتظار کے دن کٹنے لگے، صبح ہوتے ہی ہماری نگاہ کیلنڈر پر جاتی۔ میرا مکان بکرم کے مکان سے ملا ہوا تھا۔ سکول جانے سے قبل اور سکول سے آنے کے بعد ہم دونوں ساتھ بیٹھے اپنے اپنے منصوبے باندھا کرتے اور سرگوشیوں میں کہ کوئی سن نہ لے۔ ایک دن شادی کا تذکرہ چھڑ گیا۔

بکرم نے فلسفیانہ انداز میں کہا، بھئی میں شادی وادی کا جنجال نہیں پالنا چاہتا خواہ مخواہ کی کوفت اور پریشانی، بیوی کی ناز برداری ہی میں بہت سے روپے اڑ جائیں گے۔ ہم بقائے نسل کے کوئی ٹھیکہ دار ہیں۔

مَیں نے شادی کے دوسرے پہلوؤں پر غور کیا ، ہاں یہ تو درست ہے ، مگر جب تک شادی و غم میں کوئی رفیق نہ ہو ، دولت کا لطف ہی کیا ، تنہا خوری سے انسان کی طبیعت خود نفرت کرتی ہے۔ مَیں تو بھئی عیالداری سے اتنا بیزار نہیں۔ ہاں رفیق ایسا چاہتا ہوں جو صحیح معنوں میں رفیق ہو ، اور وہ بیوی کے سوا دوسرا کون ہو سکتا ہے۔

بکرم کی پیشانی پر بل پڑ گئے ، بولا خیر اپنا اپنا نقطۂ نظر ہے۔ آپ کو عیال داری مبارک بندہ تو آزاد رہے گا۔ اپنا مزے سے جہاں چاہا اڑ گئے۔ اور جب جی چاہا سو گئے۔ یہ نہیں کہ ہر وقت ایک پاسبان آپ کی ہر حرکت پر آنکھیں لگائے بیٹھا رہے ، ذرا سی دیر ہوئی اور فوراً جواب طلب آپ کہیں چلے اور فوراً سوال ہوا ، کہاں جاتے ہو؟ کیوں کسی کو مجھ سے یہ سوال کرنے کا حق ہو۔

مَیں نہ یہ سوال کسی سے کرنا چاہتا ہوں اور نہ چاہتا ہوں کہ مجھ سے کوئی یہ سوال کرے ، نا بابا آپ کو شادی مبارک ، بچّے کو ذرا سا زکام ہوا اور آپ اڑے چلے جا رہے ہیں ہومیوپیتھک ڈاکٹر کے پاس ، ذرا عمر کھسکی اور لونڈے منتیں ماننے لگے کہ کب آپ راہی عدم ہوں اور وہ گل چھرّے اڑائیں ، نہ نہ میں اس وبال ..... بکرم کی بہن کُنتی نے اتنے دھماکے سے دروازہ کھولا کہ ہم دونوں چونک پڑے ، کوئی تیرہ چودہ سال کی تھی ، مگر بڑی خوش مزاج ، اور انتہا درجہ شوخ۔

بکرم نے ڈانٹا تو بڑی شیطان ہے کُنتی ، میں تو ڈر گیا ، کس نے تجھے بلایا یہاں؟

کُنتی نے مشبہ نظروں سے بکرم کو دیکھا ، جیسے کوئی تحقیقات کر رہی ہو ، اور بولی تم لوگ ہر دم یہاں بیٹھے کیا باتیں کرتے ہو۔ جب دیکھو یہیں جمے ہو۔ نہ کوئی کام نہ دھندا کہیں گھومنے بھی نہیں جاتے ، ایسے اچھے اچھے تماشے آئے اور چلے گئے۔ تم چلے ہی نہیں۔ آخر میں کس کے

ساتھ جاؤں، کیا کوئی جادو منتر جگا رہے ہو؟

بکرم ہنسا، ہاں جادو جگا رہے ہیں۔ جس میں تجھے ایسا دولہا ملے گا، جو گن کر روز پانچ ہنٹر جمائے۔

کُنتی نے پیٹھ کی طرف سے اس کے گلے میں باہیں ڈال دیں اور بولی مجھے اپنا بیاہ ہی نہیں کرنا ہے۔ اماں سے پچاس ہزار روپے لے لوں گی اور مزے سے عیش کروں گی۔ کیوں کسی مرد کی غلامی کروں کھلائے گا تو دو روٹیاں اور حکومت ایسی جتائے گا گویا اس کی زرخرید لونڈی ہوں، بندی باز آئی ایسی شادی سے، میں روز اماں کے ٹکٹ کے لیے ایشور سے پرارتھنا کرتی ہوں، اماں کہتی ہیں کنواری لڑکیوں کی دعائیں بڑی تاثیر ہوتی ہے۔ میرا تو دل کہتا ہے اماں کو ضرور روپے ملیں گے۔

مجھے اپنی تنہیال کا ایک واقعہ یاد آیا۔ ایک بار دیہات میں بارش بالکل نہ ہوئی تھی بھادوں کا مہینا آگیا اور پانی کی ایک بوند نہیں، تب گاؤں والوں نے چندہ کر کے گاؤں کی سب کنواری لڑکیوں کی دعوت کی تھی۔ اور دوسرے دن موسلا دھار بارش ہوئی تھی ضرور کنواریوں کی دعائیں تاثیر ہوتی ہے۔

میں نے بکرم کو پر معنی نظروں سے دیکھا۔ بکرم نے مجھے نظروں ہی نظروں میں، ہم نے فیصلہ کر لیا۔ ایسا شیفع پا کر کیوں چوکیے۔

بکرم بولا اچھا بیٹی، تجھ سے ایک بات کہیں، کسی سے کہے گی تو نہیں، اگر کہا تو حلال ہی کر دوں گا۔ میں اب کے تجھے خوب دل لگا کے پڑھاؤں گا اور پاس کرا دوں گا۔ ہم دونوں نے بھی لاٹری کا ٹکٹ لیا ہے، ہم لوگوں کے لیے بھی ایشور سے دعا کرو، اگر روپے مل گئے تو تجھے ہیرے جواہرات سے مڑھ دیں گے۔ سچ مگر خبردار کسی سے کہنا مت۔ مگر کُنتی

کا ہاضمہ اتنا مضبوط نہ تھا، یہاں سے تو وعدہ کرکے گئی، مگر اندر جاتے ہی بھانڈا پھوڑ دیا ایک ہی لمحہ میں سارے گھر میں خبر پھیل گئی اب جسے دیکھئے ہم دونوں کو آنکھیں دکھا رہا ہے۔ پانچ روپے لے کر پانی میں ڈال دیئے، گھر میں چار ٹکٹ تو تھے ہی پانچویں کی کیا ضرورت ہے، یہ ماسٹر اسے خراب کر رہا ہے، نہ کسی سے پوچھا نہ گچھا، لے کے روپے پھینک، خود افضیحت والی کہاوت سامنے آئی۔ گھر کے بزرگ چاہے گھر میں آگ لگا دیں۔ کوئی کچھ نہیں کر سکتا، بچارے چھوٹے ان کی مرضی کے خلاف آواز بھی نکالیں تو کہرام مچ جاتا ہے۔

(۳)

بکرم کے والد بڑے ٹھاکر کہلاتے تھے چچا چھوٹے ٹھاکر، دونوں ہی ملحد تھے، بچے ناستک، دیوتاؤں کے دشمن، پوجا پاٹ کا مذاق اڑانے والے، گنگا کو پانی کی دھار اور تیرتھوں کو سیر کے مقام سمجھنے والے، مگر آج کل دونوں ہی معتقد ہو گئے تھے۔ بڑے ٹھاکر صاحب روز علی الصبح ننگے پاؤں گنگا اشنان کرنے جاتے اور ادھر سے سارے شہر کے دیوتاؤں کو پوجا کرتے ہوئے کوئی گیارہ بجے لوٹتے تھے۔ چھوٹے ٹھاکر گھر ہی میں بیٹھے ہوئے روز ایک لاکھ رام کا نام لکھ کر تب جل پان کرتے۔ دونوں صاحب شام ہوتے ہی ٹھاکر دوارے میں جا بیٹھتے اور بارہ بجے رات تک بھگوت کی کتھا سنا کرتے، بکرم کے بڑے بھائی صاحب کا نام تھا پرکاش انھیں سادھوں سنتوں سے عقیدت ہو گئی تھی۔ انہیں کی خدمت میں دوڑتے رہتے، انھیں یقین ہو گیا تھا کہ جہاں کسی مہاتما نے آشیرباد دیا اور ان کا نام آیا۔ رہیں بکرم کی اماں جی ان میں ایسا کوئی تغیر کا بھی انتظام کر لیا تھا، لوگ ناحق کہتے ہیں مادہ پرستوں میں اعتقاد نہیں ہوتا میں تو سمجھتا ہوں ان میں ایسا کوئی تغیر تو نہ تھا ہاں آجکل خیرات زیادہ کرتی تھیں اور برت بھی زیادہ رکھتی تھیں۔ درگا پاٹ کا بھی انتظام کر لیا تھا

ہم میں جو اعتقاد اور پرستش اور دین داری ہے وہ ہماری مادہ پرستی کے طفیل ہے، ہمارا دین اور مذہب ہماری دنیا کے بل پر لٹکا ہوا ہے، ہوس انسان کے دل اور دماغ میں اتنی روحانیت پیدا کر سکتی ہے، یہ میرے لیے نیا تجربہ تھا اور یہ محض روحانیت کا ملمع نہ تھا۔ تو ہمات تھی، وہی خلوص، وہی نشہ، وہی انہماک گویا طبیعت ہی بدل گئی ہو۔ رہے ہم دونوں ساجھے دار ہمارے پاس روپے نہ تھے، نہ اتنا وقت تھا، مجھے نوکری بچانی تھی۔ بکرم کو کالج جانا تھا ہم دونوں ہاتھ مل کر رہ جاتے، ہاں جو تشیوں کی تلاش میں رہتے تھے، مگر ان کے لیے بھی ہمارے پاس نیاز مندی اور خدمت گزاری کے سوا اور کیا تھا۔

جوں جوں قتل کی رات قریب آتی جاتی تھی، ہمارا سکون خاطر غائب ہوتا جاتا تھا، ہمیشہ اسی طرف دھیان لگا رہتا، میرے دل میں خواہ مخواہ یہ شبہ پیدا ہونے لگا کہ کہیں بکرم مجھے حصہ دینے سے انکار کر دے تو کیا کروں۔ صاف انکار کر جائے کہ تم نے ٹکٹ میں ساجھا ہی نہیں کیا، نہ کوئی تحریر ہے نہ کوئی دوسرا ثبوت، سارا دار و مدار بکرم کی نیت پر ہے اس کی نیت میں ذرا سا خلل آیا اور میرا کام تمام، کہیں فریاد نہیں کر سکتا، زبان تک نہیں کھول سکتا۔ اب اگر تحریر کے لیے کہوں تو بدمزگی کے سوا اور کوئی نتیجہ نہیں اگر اس کی نیت بگڑ گئی ہے تب تو وہ ابھی سے انکار کر دے گا اگر نیت درست ہے تو اس شبہ سے اسے روحانی صدمہ ہوگا۔ آدمی تو ایسا نہیں ہے لیکن بھئی دولت پا کر ایمان سلامت رکھنا مشکل ہے۔ ابھی تو روپے نہیں ملے ہیں اس وقت ایماندار بننے میں کچھ حرج نہیں ہوتا، آزمائش کا وقت تو جب آئے گا جب روپے مل جائیں گے۔ میں نے اپنے باطن کا جائزہ لیا، اگر ٹکٹ میرے نام کا ہوتا اور حسن اتفاق سے میرا نام آجاتا تو کیا میں نصف رقم بے چوں وچرا بکرم کے حوالہ کر دیتا؟ کہتا تم نے مجھے ڈھائی روپے قرض دیئے تھے

اس کے بدلے پانچ لے لو، دس لے لو، سولے لو اور کیا لو گے ؟ مگر نہیں اتنی بد دیانتی کرنے کی مجھ میں جرأت نہ تھی۔ اگر دیتا بھی تو خوش معاملگی سے نہیں بلکہ بد نامی اور تشہیر کے خوف سے۔

ایک دن ہم دونوں بیٹھے اخبار پڑھ رہے تھے کہ یکایک بکرم نے کہا ہمارا ٹکٹ نکل آئے تو مجھے دل میں یہ افسوس ضرور ہو گا کہ ناحق تم سے ساجھا کیا میں نے چونک کر کہا اچھا، مگر اسی طرح کیا مجھے افسوس نہیں ہو سکتا۔

"لیکن ٹکٹ تو میرے نام کا ہے۔"

"اس سے کیا ہوتا ہے"۔

اچھا مان لو، میں کہہ دوں تم نے ٹکٹ میں ساجھا ہی نہیں کیا۔

میرے خون کی حرکت بند ہو گئی، آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔

"میں تمہیں اتنا بدنیت نہیں سمجھتا"۔

"مگر ہے بہت ممکن، پانچ لاکھ، سوچو"۔

"تم آؤ لکھا پڑھی کر لیں جھگڑا ہی کیوں ہو"۔

بکرم نے ہنس کر کہا، تم بڑے شکی ہو یار، میں تمہارا امتحان لے رہا تھا، بھلا ایسا کہیں ہو سکتا ہے، پانچ لاکھ نہیں، پانچ کروڑ کا معاملہ ہو تب بھی ایشور چاہے گا تو نیت میں فتور نہ آنے دوں گا۔

"مگر مجھے ان اعتماد انگیز باتوں سے تشفی نہ ہوئی، دل میں ایک تشویش، آگ کی چنگاری کی طرح سلگنے لگی کہیں یہ شخص سچ مچ انکار کر جائے تو کہیں کا نہ رہوں۔ میں نے کہا یہ تو میں جانتا ہوں کہ تمہاری نیت میں فتور نہیں آسکتا، لیکن تحریر سے پابند ہو جانے میں کیا ہرج ہے ؟"

"فضول ہے۔"

"فضول ہی سہی۔"

"تو پکے کاغذ پر لکھنا پڑے گا۔ دس لاکھ کی کورٹ فیس ہی دس ہزار ہو جائے گی کس خیال میں ہو آپ؟"

میں نے تامل کر کے کہا مجھے سادے کاغذ ہی سے اطمینان ہو جائے گا۔

"جس معاہدہ کی کوئی قانونی اہمیت نہ ہو، اسے لکھ کر کیوں وقت ضائع کریں۔"

"قانونی اہمیت نہ ہو اخلاقی اہمیت تو ہے۔"

"اچھا لکھ دوں گا، جلدی کیا ہے۔"

مجھے دال میں کچھ کالا نظر آیا، بگڑ کر بولا، تمہاری نیت تو ابھی سے بدلی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔

"تم کیا ثابت کرنا چاہتے ہو کہ ایسی حالت میں تمہاری نیت فاسد نہ ہوتی۔"

"میری نیت اتنی کمزور نہیں ہے۔"

"اجی رہنے بھی دو بڑے نیت والے دیکھے ہیں۔"

"مجھے اب تمہارے اوپر اعتبار نہیں رہا، میں تم سے معاہدہ لکھوا کر چھوڑوں گا، چاہے دوستی کا خاتمہ ہی کیوں نہ ہو جائے۔"

بڑے نشست خانے میں جہاں دونوں ٹھاکر بیٹھا کرتے تھے۔ اسی طرح کا مناظرہ چھڑا ہوا تھا۔ جھڑپ کی آواز سن کر ہمارا دھیان ادھر لگا، دیکھا تو دونوں بھائیوں میں ہاتھا پائی ہو رہی ہے، سچ مچ دونوں اپنی اپنی کرسیوں پر پہلوئے بدل رہے تھے۔ چھوٹے ٹھاکر نے کہا مشترکہ خاندان میں کسی کے نام سے روپے آئیں، ان پر سب کا مساوی حق ہے۔

بڑے ٹھاکر نے بگڑ کر جواب دیا، ہرگز نہیں، جاکر قانون دیکھو اگر میں کوئی جرم کروں تو مجھے سزا ہوگی، مشترکہ خاندان کو نہیں یہ انفرادی معاملہ ہے۔

"اس کا فیصلہ عدالت کرے گی"۔

"شوق سے عدالت جائیے، اگر میرے لڑکے، بیوی یا خود میرے نام لاٹری نکلی تو آپ کو اس سے اسی طرح کوئی تعلق نہ ہوگا، جیسے آپ کے نام لاٹری نکلے تو مجھ سے یا میرے لڑکے سے یا میری بیوی سے"

"اگر میں جانتا، آپ یہ پہلو اختیار کریں گے، تو اپنی بیوی بچوں کے نام سے ٹکٹ لے لیتا"

"تو یہ آپ کا قصور ہے۔"

"اسی لیے مجھے خیال تھا کہ آپ میرے حقیقی بھائی ہیں اور یکجائی کا معاملہ ہے"

"یہ جوا ہے یہ آپ کو سمجھ لینا چاہیے"

بکرم کی ماں نے دونوں بھائیوں کو شمشیر بکف دیکھا، تو دوڑی ہوئی باہر آئیں اور دونوں کو سمجھانے لگیں۔

چھوٹے ٹھاکر صاحب بھرائی ہوئی آواز میں بولے، آپ مجھے کیا سمجھاتی ہیں۔ انھیں سمجھائیے جو بھائی کی گردن پر چھری پھیر رہے ہیں۔ آپ کے پاس چار ٹکٹ ہیں، میرے پاس صرف ایک میرے مقابلہ میں آپ لوگوں کو روپے ملنے کا چوگنا چانس ہے۔

بڑے ٹھاکر سے نہ رہا گیا، ہم نے بیس روپے نہیں دیئے ٹھنا ٹھن۔

اماں نے انہیں ملامت کے انداز سے دیکھا اور چھوٹے ٹھاکر صاحب کو ٹھنڈا کیا لو میں تم میرے روپے سے آدھے لے لینا میں اپنے بیٹے .....

بڑے ٹھاکر نے زبان پکڑ لی۔ کیوں واہیات قسم کھا رہی ہو، وہ کیوں آدھا لے

لیں گے میں ایک دھیلا بھی نہ چھونے دوں گا، اگر ہم انسانیت سے کام لیں تو بھی انہیں پانچویں حصہ سے زائد کسی طرح نہ ملے گا، آدھے کا دعویٰ کس بنا پر ہو سکتا ہے۔

چھوٹے ٹھاکر نے خونی نظروں سے دیکھا، ساری دنیا کا قانون آپ ہی جانتے ہیں۔

"جانتے ہیں، بیس سال تک وکالت نہیں کی ہے"

"یہ وکالت نکل جائے گی جب سامنے کلکتہ کا وکیل کھڑا کر دوں گا۔"

"بیرسٹر کی ایسی تیسی"

"اچھا زبان سنبھالیے میں نصف لوں گا اسی طرح جیسے گھر کی جائیداد میں میرا نصف ہے"

بڑے ٹھاکر صاحب کوئی توپ چھوڑنے والے ہی تھے کہ مسٹر پرکاش سر اور ہاتھ میں پٹی باندھے خوش خوش لنگڑاتے ہوئے آکر کھڑے ہو گئے، بڑے ٹھاکر صاحب نے گھبرا کر پوچھا، تمہیں کیا ہو گیا، ارے یہ چوٹ کیسی، کس سے جھگڑا ہو گیا، یا گر گرا پڑے، ارے منہگو! جا ذرا ڈاکٹر صاحب کو بلا لا۔

اماں جی نے پرکاش کو ایک آرام کرسی پر لٹا دیا تھا اور دفورِ اشک سے کچھ پوچھ نہ سکتی تھیں۔

پرکاش نے کراہ کر حسرتناک لہجہ میں کہا، کچھ نہیں، ایسی کچھ چوٹ نہیں لگی۔ بڑے ٹھاکر صاحب نے جو غم و غصہ سے کانپ رہے تھے، کیسے کہتے ہو چوٹ نہیں لگی سارا ہاتھ اور سر سُوج گیا ہے، کہتے ہو چوٹ نہیں لگی، کس سے جھگڑا ہوا، کیا معاملہ ہے۔ بتلاتے کیوں نہیں، میں جا کر تھانے میں رپٹ کرتا ہوں۔

"آپ ناحق گھبراتے ہیں، بہت معمولی چوٹ ہے، دو چار روز میں اچھی ہو جائے گی"

اس کے چہرے پر اب بھی ایک مسرت آمیز امید جھلک رہی تھی، ندامت، غصہ یا

انتقام کی خواہش کا نام تک نہ تھا۔

اماں نے آواز کو سنبھال کر پوچھا۔ بھگوان کریں، جلد اچھے ہوجاؤ، لیکن چوٹ لگی کیسے کیا کسی تانگے سے گر پڑے۔

پرکاش نے درد سے ناک سکوڑ کر مسکراتے ہوئے کہا، کچھ نہیں، نہ کسی تانگہ سے گرا، نہ کسی سے جھگڑا ہوا، ذرا جھکڑ بابا کے پاس چلا گیا تھا، یہ انہیں کی دعا ہے۔ آپ تو جانتے ہیں وہ آدمیوں کی صورت سے بھاگتے ہیں اور پتھر لے کر مارنے دوڑتے ہیں، جو ڈر کر بھاگا وہ نامراد رہ جاتا ہے۔ جو پتھر کی چوٹیں کھا کر بھی ان کا پیچھا نہیں چھوڑتا اس کی مراد پوری ہو جاتی ہے بس یہی سمجھ لیجئے کہ چوٹ کھائی اور پارس ہوئے آج میں وہاں پہنچا تو ایک میلہ لگا ہوا تھا۔ کوئی مٹھائیاں لیے کوئی پھولوں کی مالا، کوئی شال دوشالے، جھکڑ بابا استغراق کی حالت میں بیٹھے تھے یکایک انھوں نے آنکھیں کھولیں اور یہ مجمع دیکھا تو گالیاں بکتے ہوئے کئی پتھر اٹھا کر دوڑے، مجمع میں بھگدڑ پڑ گئی، لوگ گرتے پڑتے بھاگے، لیکن بندہ وہاں قطب مینار کی طرح ڈٹا رہا۔ بس انھوں نے پتھر چلا ہی تو دیا، پہلا پتھر سر میں لگا، کھوپڑی بھنا گئی معلوم ہوا، جیسے گولا لگ گیا ہو آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا، ابھی سنبھلنے بھی نہ پایا تھا کہ دوسرا پتھر ہاتھ میں لگا، بس وہیں ڈھیر ہو گیا۔ بابا گالیاں بکتے ہوئے لوٹ گئے ادھر گھنٹہ بھر تک تو مجھ سے اُٹھا ہی نہ گیا۔ آخر ہمت باندھ کر اٹھا اور ڈاکٹر صاحب کے پاس گیا انھوں کہا کہ فریکچر ہو گیا ہے۔ پٹی باندھ دی بڑی شدت کا درد ہے، مگر مراد پوری ہو گئی اب لاٹری میرے نام آئی رکھی ہے، سب سے پہلے جھکڑ بابا کی کٹی بنواؤں گا۔ ان کی مار کھا کر آج تک کوئی نامراد نہیں لوٹا۔

بڑے ٹھاکر صاحب نے اطمینان کا سانس لیا، امان جی کا اندیشہ بھی دور ہو گیا سر پھٹا تو کیا ہوا، ہاتھ بھی ٹوٹا تو کیا ہوا لاٹری تو اپنی ہو گئی۔

شام ہو گئی تھی، بڑے ٹھاکر صاحب مندر کی طرف چلے گئے۔ بھاگوت سننے کا وقت آگیا تھا، چھوٹے ٹھاکر صاحب وہیں بیٹھے رہے، ان کے پیٹ میں چوہے دوڑ رہے تھے جھکڑ بابا تو وہیں رہتے ہیں ندی کے کنارے بیچہ میں"۔

پرکاش نے بے اعتنائی سے کہا 'جی ہاں'

"کیا بہت زور سے مارتے ہیں"؟

پرکاش نے ان کا عندیہ سمجھ لیا۔

آپ زور سے کہتے ہیں، ارے صاحب ایسا پتھر مارتے ہیں کہ بم گولے سا لگتا ہے، دیو سا تو قد ہے اور شہ زور اتنے ہیں کہ لوگ کہتے ہیں شیروں کو ایک گھونسے میں مار ڈالتے ہیں۔ اُف سر پھٹا جاتا ہے، ان کا نشانہ ایسا بے خطا ہوتا ہے کہ آدمی بچ ہی نہیں سکتا، ایک دو پتھر سے زیادہ کھانے کی کسی میں تاب ہی نہیں، اور یہ نہیں کہ ایک دو پتھر مار کر رہ جائیں، جب تک آپ دوڑتے جائیں گے مارتے جائیں گے، جب تک آپ گر نہ پڑیں، مگر راز یہ ہے کہ آپ جتنے زیادہ پتھر کھائیں گے اتنا ہی اپنے مقصد سے قریب پہنچیں گے، ایک چوٹ کھا کر جان بچانے کے لیے کوئی بہانہ کر کے گر پڑے تو اس کا پھل بھی اتنا ہی ملتا ہے، آدھا یا اس سے بھی کم، میں نے ٹھان لیا تھا کہ چاہے مر ہی جاؤں لیکن جب تک نہ گر پڑوں پیچھا نہ چھوڑوں گا۔

پرکاش نے ایسا ہیبت ناک مرقع کھینچا کہ چھوٹے ٹھاکر صاحب کانپ گئے جھکڑ بابا کی خدمت میں جانے کی ہمت نہ پڑی۔

(۴)

آخر جولائی کی بیسویں تاریخ آئی، سویرے ہی سے ڈاک خانہ کے سامنے کئی ہزار آدمیوں کا مجمع ہو گیا، تار کا انتظار ہونے لگا، دونوں ٹھاکروں نے گھڑی رات رہے گنگا اشنان کیا اور مندر میں بیٹھ کر پوجا کرنے لگے، ہم دونوں ساجھے داروں نے اپنا اپنا کام تقسیم کر لیا، بکرم تو ڈاک خانے گیا میں مندر میں دیوتاؤں کے قدموں میں جا بیٹھا، دونوں ٹھاکر بھی بیٹھے پوجا کر رہے تھے، ان کے چہروں پر ایک رنگ آتا تھا ایک جاتا تھا، بالکل بچوں کی سی کیفیت تھی جو ذرا سی بات میں ہنس دیتے ہیں اور ذرا سی بات میں رو دیتے ہیں۔

بڑے ٹھاکر نے پوچھا بھگوان تو اپنے بھگتوں پر بڑی دیا رکھتے ہیں کیوں پجاری جی؟ پجاری نے فرمایا، ہاں سرکار! گج[1] کو گراہ کے منہ سے بچانے کے لیے بھگوان چھیر ساگر سے دوڑتے تھے۔

چھوٹے ٹھاکر نے پوچھا، بھگوان تو انتر جامی (عالم الغیب ہیں) کس میں کتنی بھگتی ہے یہ ان سے کیا چھپا رہتا ہو گا۔

پجاری نے فرمایا نہیں سرکار ان سے کیا چھپا ہے۔

ادھر پوجا ہو رہی تھی ادھر مندر کے باہر غلہ تقسیم کیا جا رہا تھا۔

---

[1] روایت ہے کہ ایک بار ہاتھی (گج) ندی میں پانی پینے گیا ندی میں ایک مگر تھا اس نے ہاتھی کی ٹانگ پکڑ لی، ہاتھی نے تب بھگوان کی یاد کی اور بھگوان اپنی جائے قیام چھیر ساگر (دودھ کے سمندر) سے ہاتھی کی مدد کو دوڑے۔

بڑے ٹھاکر نے پوچھا تمہارا دل کیا کہتا ہے پجاری جی۔
پجاری نے فرمایا آپ کی پھتے (فتح) ہو گی۔
چھوٹے ٹھاکر نے پوچھا اور میری؟
پجاری نے بے تکلف کہا، آپ کی بھی پھتے ہو گی۔
دونوں آدمیوں کی فتح کیسے ہو گی اس پر غور کرنے کی وہاں کسے فرصت تھی۔ کتھا ختم ہو گئی تو بڑے ٹھاکر صاحب نشۂ عقیدت سے سرشار مندر سے نکلے بھجن گاتے ہوئے۔

پربھو میں تو تیری چرنوں میں آیا

چھوٹے ٹھاکر صاحب بھجوت پیٹتے حمد و ثنا میں مصروف تھے۔

پیروں تلے بچھایا کیا خوب فرش خاکی
اور سر پہ لاجوردی کیا آسماں بنایا
زندگی میں جب ترا ہم کو ہمیشہ تھا خیال
بعد مرون بھی ہو س دل میں وہی لے جائیں گے

پرکاش بابو پٹیاں باندھے غریبوں کو غلہ بانٹ رہے تھے اور بار بار فون پر جا کر پوچھتے تھے کیا خبر ہے۔
ہر شخص کے چہرہ پر امید و بیم کا رنگ تھا، امید رگوں میں، آنکھوں میں، ہونٹوں پر اڈی پڑتی تھی اور بیم دل میں، دماغ میں، جگر میں رعشہ پیدا کر رہا تھا۔
ٹیلی فون کی گھنٹی زور سے بجی سب کے سب دوڑے ریسور بکرم کے ہاتھ لگا "کون ہے"
"میں ہوں بکرم"
"کیا خوش خبری ہے"۔

"اس شہر کا صفایا ہو گیا، شہر ہی کا نہیں پورے ہندوستان کا، امریکہ کے ایک آدمی کا نام آیا ہے"

پرکاش بابو زمین پر گر پڑے، بڑے ٹھاکر پر جیسے فالج گر گیا۔ بے حس و حرکت نقشِ دیوار کی طرح کھڑے رہ گئے، چھوٹے ٹھاکر صاحب سر پیٹ کر رونے لگے۔

رہا میں، مجھے مایوسی کے ساتھ ایک حاسدانہ مسرت ہو رہی تھی کہ مجھے بکرم کی خوشامد کرنے میں ذلت نہیں اٹھانی پڑی۔ اماں جان باہر نکل آئیں اور کہہ رہی تھیں سبھوں نے بے ایمانی کی کون وہاں دیکھنے گیا تھا۔

اس روز رات کو کسی نے کھانا نہیں کھایا، بڑے ٹھاکر صاحب نے پجاری جی پر غصہ اُتارا اور انھیں برخاست کر دیا، اس لیے تمہیں اتنے دنوں سے پال رکھا ہے۔ حرام کا مال کھاتے ہو اور چین کرتے ہو

اتنے میں بکرم رونی صورت لئے آکر بیٹھ گیا۔

میں نے پوچھا اب تو معاملہ ختم ہو گیا مگر سچ کہنا تمہاری نیت فاسد تھی یا نہیں؟

بکرم بے غیرتی کے ساتھ مسکرا پڑا۔

"اب کیا کرو گے پوچھ کر پردہ ڈھکا رہنے دو۔

خانہ داماد

جیٹھ کا دوپہر تھا، ہری دھن ایکھ کے کھیت میں پانی دے کر آیا اور باہر بیٹھا رہا، گھر میں سے دھواں اٹھتا ہوا نظر آ رہا تھا اور ساتھ ہی کھن کھن کی آواز آ رہی تھی، اس کے دونوں سالے اس کے بعد آئے اور گھر میں چلے گئے۔ اُن دونوں کے لڑکے بھی آئے اور اسی طرح گھر میں داخل ہو گئے، خصوصاً کل اسے جیسی ڈانٹ سہنی پڑی تھی وہ اس کے پیروں میں بیڑیاں سی ڈالے ہوئے تھی، کل اس کی ساس ہی نے تو کہا تھا کہ میرا جی تم سے بھر گیا میں کوئی تمہاری زندگی بھر کا ٹھیکہ لئے بیٹھی ہوں کیا؟ سب سے بڑھ کر اس کی بیوی کے بیدردانہ سلوک نے اس کے دل کو پاش پاش کر دیا تھا وہ بیٹھی ہوئی اس ساری ڈانٹ پھٹکار کو سنتی رہی مگر اس کے منہ سے ایک مرتبہ بھی نہ نکلا کہ اماں! تم کیوں ان کی بے عزتی کر رہی ہو؟ چپ چاپ بیٹھی سنتی رہی، شاید میری درگت پر وہ خوش ہو رہی تھی، اس گھر میں وہ کیسے جائے کیا پھر وہی گالیاں کھانے، وہی دل دوز

باتیں سننے کے لیے ، اور آج اس گھر میں زندگی کے دس سال گزر جانے پر یہ حال ہو رہا ہے ، کیا میں کسی سے کم کام کرتا ہوں ، دونوں سالے میٹھی نیند سوتے رہتے ہیں اور میں بیلوں کو چارہ پانی دیتا ہوں ، چھانٹی کاٹتا ہوں ، وہاں سب لوگ پل پل پر چلم پیتے ہیں ، میں آنکھیں بند کیے اپنے کام میں لگا رہتا ہوں ۔ شام کو گھر والے گانے بجانے چلے جاتے ہیں میں بڑی رات تک گائیں بھینسیں دوہتا رہتا ہوں ۔ ان سب کاموں کے لیے یہ انعام مل رہا ہے کہ کوئی مجھے کھانے کو بھی نہیں پوچھتا ، الٹی اور گالیاں ملتی ہیں ۔

اس کی عورت گھر سے ڈول لے کر نکلی اور بولی ، ذرا اسے کنوئیں سے کھینچ تو لو ، گھر میں ایک بوند پانی نہیں ۔

ہری دھن ڈول لے کر کنوئیں پر گیا اور پانی بھر لایا ۔ اسے زور کی بھوک لگ رہی تھی ، سمجھا اب کھانے کو بلانے آوے گی ۔ مگر عورت ڈول لے کر اندر گئی ، تو وہیں کی ہو رہی ، ہری دھن تھکا ماندہ بھوک سے بے قرار پڑا پڑا سو گیا ۔

دفعتہً اس کی بیوی نے آ کر اسے جگایا ۔

ہری دھن نے پڑے پڑے کہا ، کیا ہے کیا ، پڑا بھی رہنے دے گی ، کیا اور پانی چاہیے :

گمانی سخت لہجے میں بولی ، غراتے کیوں ہو ، کھانے کو بلانے آئی ہوں

ہری دھن نے دیکھا اس کے دونوں سالے اور بڑے سالے کے دونوں لڑکے کھانا کھائے ہوئے چلے آ رہے ہیں اس کے بدن میں آگ لگ گئی میری اب یہ نوبت پہنچ گئی کہ ان لوگوں کے ساتھ بیٹھ کر کھا بھی سکتا ، یہ لوگ مالک ہیں میں ان کی جھوٹی پتیل چاٹنے والا ہوں ۔ میں ان کا کتا ہوں ، جسے کھانے کے بعد روٹی کا ٹکڑا پھینک دیا جاتا ہے ۔

یہی گھر ہے جہاں آج سے دس برس پہلے اس کی کتنی آؤ بھگت ہوتی تھی، سالے غلام بنے رہتے تھے، ساس منہ چومتی رہتی تھی، بیوی پوجا کرتی تھی۔ تب اس کے پاس روپیہ تھا، جائداد تھی، اب وہ مفلس ہے اس کی ساری جائداد کو ان ہی لوگوں نے برباد کر دیا، اب اسے روٹیوں کے لالے پڑ رہے ہیں۔ اس کے دل میں ایک شعلہ سا بھڑک اٹھا کہ اسی وقت اندر جا کر ساس اور سالوں کو خوب لعنت ملامت کرے مگر ضبط کر کے رہ گیا، پڑے پڑے بولا۔ مجھے بھوک نہیں ہے آج نہ کھاؤں گا۔

گمانی نے کہا، نہ کھاؤ میری بلا سے! ہاں نہیں تو، کھاؤ گے تمہارے ہی پیٹ میں جائے گا۔ کچھ میرے پیٹ میں تھوڑا چلا جائے گا۔

ہری دھن کا غصہ آنسو بن گیا، یہ میری بیوی ہے جس کے لیے میں نے اپنا سب کچھ سوا ہا کر دیا۔ مجھے اُلو بنا کر اب یہ سب لوگ نکال دینا چاہتے، وہ اب کہاں جائے گیا کرے۔

اس کی ساس آ کر بولی، چل کر کھا کیوں نہیں لیتے جی، روٹھتے کس سے ہو، یہاں تمہارے نخرے اُٹھانے کا کسی میں بل بوتہ نہیں ہے۔ جو دیتے ہو وہ نہ دینا اور کیا کرو گے تم کو بیٹی بیاہی ہے، کچھ تمہاری زندگی بھر کا ٹھیکہ تو نہیں لیا ہے۔

ہری دھن نے پیچ و تاب کھا کر کہا، ہاں اماں میری غلطی تھی میں ویسا ہی سمجھ رہا تھا اب میرے پاس دھرا ہی کیا ہے کہ تم میری زندگی کا ٹھیکہ لو گی، جب میرے پاس روپیہ تھا میں سب کچھ تھا، اب غریب ہوں تو تم کیوں بات پوچھو گی۔

بوڑھی ساس بھی منہ پھلائے ہوئے اندر چلی گئی۔

(۲)

بچوں کے لیے باپ ایک فالتو چیز، ایک تکلف ہے، جیسے گائے کے لیے کھلی اور بالوؤں کے لیے چٹنی، ماں دال روٹی ہے، چٹنی عمر بھر نہ ملے تو ہرج ہی کیا ہے؟ مگر روٹی دال ایک دن بھی نہ ملے تو پھر دیکھئے کیا حال ہوتا ہے، باپ کا درشن کبھی کبھی صبح، شام مل جاتا ہے وہ بچّہ اچھالتا ہے، پیار کرتا ہے اور کبھی اسے گود میں لے کر یا انگلی پکڑ کر سیر کرانے لے جاتا ہے بس یہی اس کے فرائض کی حد ہے وہ پردیس چلا جائے، بچّہ کو پروا نہیں ہوتی، مگر ماں تو بچّہ کے لیے سبھی کچھ ہے، وہ ایک لمحہ کے لیے بھی اس کی جدائی برداشت نہیں کرسکتا ماں کہیں ہو اسے پروا نہیں۔ اسے تو ایک اچھالنے کدانے والا ایک آدمی چاہیے مگر ماں اس کی اپنی ہی ہونی چاہیے، سولہ آنے اپنی، وہی روپ، وہی رنگ، وہی پیار، وہی سب کچھ وہ اگر نہیں ہے تو گویا بچّہ کی زندگی کا چشمہ خشک ہو جاتا ہے پھر تو وہ شیو جی کا نادیا ہے جس پر پھول پانی چڑھانا لازمی نہیں محض اختیاری ہے۔

ہری دھن کی ماں کا آج دس سال ہوئے انتقال ہو گیا تھا، اس وقت وہ بیاہا جا چکا تھا، وہ سولہ سال کا تھا، مگر ماں کے مرتے ہی اسے معلوم ہوا کہ میں کتنا بے کس ہوں جیسے اس گھر پر اس کا کوئی حق ہی نہ رہا ہو، بہنوں کی شادیاں ہو چکی تھی، بھائی کوئی نہ تھا بیچارہ تنہا گھر میں جاتے ہوئے بھی ڈرتا تھا، ماں کے لیے روتا تھا، مگر ماں کے سایہ سے خوف کھاتا تھا۔ جس کوٹھڑی میں اس کی جان نکلی تھی ادھر وہ نظر تک نہ اٹھاتا تھا، گھر میں ایک بُوا تھی جو ہری دھن کو بہت چاہتی تھی، اسے اب دُودھ زیادہ ملتا، کام بھی کم کرنا پڑتا، بُوا بار بار پوچھتی، بیٹا کچھ کھاؤ گے؟ باپ بھی اب زیادہ پیار کرتا اس کے لیے ایک گائے الگ منگوا دی تھی۔ کبھی کبھی اسے کچھ پیسے دیتا کہ جس

طرح چاہے خرچ کرے، مگر یہ سارے مرہم اس زخم کو مندمل نہ کر سکتے تھے جس نے دل کو مجروح کر رکھا تھا۔ یہ لاڈ پیار بار بار اس کو ماں کی یاد دلاتا۔ ماں کی جھڑکیوں میں جو مزہ تھا وہ کیا اس پیار میں تھا؟ پہلے وہ تندرست تھا مانگ مانگ کر کھاتا تھا، لڑ لڑ کر کھاتا تھا اب وہ بیمار تھا، اچھی سے اچھی چیزیں دی جاتی تھیں مگر اسے بھوک نہ تھی۔

سال بھر تک وہ اسی حالت میں رہا، پھر تغیر واقع ہوا، اور ایک نئی عورت جسے لوگ اس کی ماں کہتے تھے۔ اس کے گھر میں آئی، اور دیکھتے دیکھتے ایک کالی گھٹا کی طرح اس کی دنیا پر چھا گئی ساری ہریالی سارے اجالے پر تاریکی کا پردہ پڑ گیا، ہری دھن نے اس نقلی ماں سے بات تک نہ کی اس کے پاس کبھی گیا تک نہیں، ایک روز گھر سے نکلا اور سسرال چلا گیا۔

باپ نے بار بار بلایا مگر اس کے جیتے جی وہ پھر گھر نہ گیا، جس دن باپ کے انتقال کی خبر ملی اسے ایک قسم کی حسد آمیز مسرت ہوئی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو کا ایک قطرہ بھی نہ نکلا

اس نئی دنیا میں آکر ہری دھن کو پھر ایک مرتبہ گھر کی محبت کا سا سکھ ملا۔ اس کی ساس نے کسی رشی کے پردان کی طرح سے اس کے بے لطف زندگی کو دلچسپیوں سے معمور کر دیا۔ اس میں ہریالی پیدا ہو گئی۔ سالیوں کی چھیڑ چھاڑ میں، ساس کی شفقت میں سالوں کے مذاق میں اور بیوی کی محبت میں اس کے دل کی ساری مرادیں پوری ہو گئیں ساس کہتی بیٹا تم اس گھر کو اپنا ہی سمجھو، تمہیں میری آنکھوں کے تارے ہو، وہ اس سے اپنے لڑکوں کی بھوؤں کی شکایت کرتی، وہ دل میں سمجھتا کہ ساس جی مجھے اپنے بیٹوں سے زیادہ چاہتی ہیں، باپ کے مرتے ہی وہ گھر گیا اور اپنے حصے کی جائیداد فروخت کر کے

روپیہ کی تھیلی لیے ہوئے پھر واپس آگیا، اب اس کی دوگنی قدر و منزلت ہونے لگی، اس نے اپنی ساری پونجی ساس کے چرنوں پر رکھ کر اپنے کو خوش نصیب سمجھا، اب تک اسے کبھی کبھی گھر کی یاد آجاتی تھی اب بھول کر بھی اس کی یاد نہ آتی تھی، گویا وہ گھر اس کی زندگی کا خوفناک واقعہ تھا جسے بھول جانا ہی بہتر تھا وہ سب سے پہلے اُٹھتا، سب سے زیادہ کام کرتا اس کی محنت و تندہی دیکھ کر گاؤں کے لوگ دانتوں تلے انگلی دباتے تھے، اس کے خسر کی قسمت کو سراہتے جسے ایسا داماد ملا تھا لیکن جوں جوں دن گزرتے گئے اس کی خاطرداری میں کمی واقع ہوتی گئی۔ وہ پہلے دیوتا تھا پھر گھر کا آدمی اور بالآخر گھر کا غلام ہو کر رہا۔ روٹیوں میں بھی خلل واقع ہوا توہین ہونے لگی اگر گھر کے لوگ بھوکوں مرتے اور ان کے ساتھ اسے بھی مرنا پڑتا تو اسے ذرا بھی شکایت نہ ہوتی لیکن جب وہ دیکھتا اور لوگ تو مونچھوں پر تاؤ دے رہے ہیں صرف میں ہی دودھ کی مکھی بنا دیا گیا ہوں تو اس کے دل سے ایک آہِ سرد نکل جاتی ابھی وہ صرف پچیس سال کا ہی تو تھا اتنی عمر اس گھر میں کیسے کٹے گی۔

اور تو اور اس کی بیوی نے بھی آنکھیں پھیر لیں یہ اس کی مصیبت کا سب سے دردناک پہلو تھا۔

(۳)

ہری دھن تو ادھر بھوکا پیاسا فکر و تشویش کی آگ میں جل رہا تھا اور ادھر مکان کے اندر ساس اور سالوں میں باتیں ہو رہی تھیں، گمانی بھی ہاں میں ہاں ملاتی جاتی تھی۔ بڑے سالے نے کہا، ہم لوگوں کی برابری کرتے ہیں، یہ نہیں سمجھتے کہ کسی نے ان کی عمر بھر کا ٹھیکہ تھوڑا ہی لے لیا ہے، دس سال ہو گئے۔ اتنے دنوں میں کیا دو تین ہزار نہ کھا

گئے ہوں گے ؟

چھوٹا سالا بولا، مجور (مزدور) ہو تو انسان جھڑکے بھی، ڈانٹے بھی، اب انھیں کوئی کیا کہے، نہ جانے ان سے کبھی پنڈ چھوٹے گا بھی یا نہیں، اپنے دل میں کہتے ہوں گے میں نے انھیں دو ہزار روپے دے رکھے ہیں، یہ نہیں سمجھتے ان کے دو ہزار کب کے صاف ہو گئے سوا سیر تو ایک جوان کو چاہیے۔

ساس نے متانت سے کہا بڑی بھاری خوراک ہے۔

گمانی سر سے جوئیں نکال رہی تھی بولی نکمے آدمی کو کھانے کے سوا اور کام ہی کیا رہتا ہے، بڑا سالا۔ کھانے کی کوئی بات نہیں ہے، جسے جتنی بھوک ہو کھائے مگر کچھ پیدا بھی تو کرنا چاہیے، یہ نہیں سمجھتے کہ مہمانی میں کس کے دن کے ہیں۔

چھوٹا سالا۔ میں تو ایک دن کہدوں گا آپ اپنی راہ لیجیے آپ کا قرضہ نہیں کھایا ہے۔

گمانی اپنے گھر والوں کی ایسی ایسی باتیں سن کر اپنے شوہر سے نفرت کرنے لگی تھی اگر وہ باہر سے چار پیسے لاتا تو اس گھر میں اس کی کتنی آؤ بھگت ہوتی، وہ بھی رانی بن کر رہتی، نہ جانے کیوں باہر جا کر کماتے ان کی نانی مرتی ہے۔

گمانی کے خیالات و جذبات ابھی بالکل طفلانہ تھے۔ اس کا اپنا کوئی گھر نہ تھا، اس گھر کے نفع نقصان کا خیال اسے بھی تھا وہ بھی اس مسئلہ کو انھیں الفاظ میں سمجھتی اور انھیں نگاہوں سے دیکھتی جیسا اس کے گھر والے، سچ تو ہے دو ہزار کیا کسی کو مول لے لیں گے۔ دس سال میں دو ہزار ہوتے ہی کیا ہیں۔ دو سو ہی تو سال بھر کے ہوئے کیا دو آدمی سال بھر میں دو سو بھی نہ کھائیں گے پھر کپڑے تھے دودھ گھی سبھی کچھ تو ہے۔ دس سال ہو گئے ایک پیتل کا چھلا بھی نہیں بنا۔ گھر سے نکلتے تو ان کے پران

جاتے ہیں، جانتے ہیں جیسے پہلے پوجا ہوتی تھی ویسے ہی ہوتی رہے گی۔ یہ نہیں سوچتے کہ پہلے اور بات تھی اب اور بات ہے۔ بہو پہلے سسرال جاتی ہے تو اس کا کتنا مہاتم ہوتا ہے، ڈولی سے اترتے ہی باجے بجتے ہیں گاؤں، محلہ کی عورتیں اس کا منہ دیکھنے آتی ہیں اور روپیہ بھی دیتی ہیں۔ مہینوں اسے گھر بھر سے اچھا کھانے کو ملتا ہے اچھا پہننے کو، کوئی کام نہیں لیا جاتا، لیکن چھ مہینے کے بعد کوئی اس کی بات بھی نہیں پوچھتا وہ گھر بھر کی لونڈی ہو جاتی ہے، ان کے گھر میں میری بھی تو وہی گت ہوئی۔ پھر رونا کاہے کو، جو یہ کہو کہ میں تو کام کرتا ہوں تو یہ تمہاری بھول ہے مجوری کی اور بات ہے۔ آدمی ڈانٹتا بھی ہے مارتا بھی ہے جب چاہتا ہے رکھتا ہے جب چاہتا ہے نکال دیتا ہے، کس کر کام لیتا ہے یہ نہیں کہ جب جی میں آیا پڑ کر سو رہے۔

(۴)

ہری ابھی پڑا ہوا اندر اندر سلگ رہا تھا کہ اس کے دونوں سالے باہر آئے۔ بڑے صاحب بولے بھیا اٹھو تیسرا پہر ڈھل گیا، کب تک سوتے رہو گے۔

ہری دھن فوراً اٹھا اور تیز لہجہ میں بولا، کیا تم دونوں نے مجھے الو سمجھ لیا ہے۔ دونوں ششدر رہ گئے جس آدمی نے کبھی زبان نہیں کھولی، ہمیشہ نوکر کی طرح ہاتھ باندھے حاضر رہا وہ آج یکایک اتنا خوددار ہو جائے، یوں آستین چڑھا کر کھڑا ہو جائے، یہ انھیں ہوش میں لانے کے لیے کافی تھا کچھ جواب نہ سوجھا۔

ہری دھن نے دیکھا ان دونوں کے قدم اکھڑ گئے ہیں بس وہ ایک دھکا دینے کی زبردست خواہش کو روک نہ سکا اسی طرح بولا۔ میری بھی آنکھیں ہیں، اندھا نہیں ہوں، نہ بہرا ہوں، چھاتی پھاڑ کر کام کروں اور اس پر کتا سمجھا جاؤں، ایسے گدھے

کہیں اور رہوں گے۔

اب بڑے صاحب بھی گرم ہو پڑے، تمہیں کسی نے یہاں باندھ تو نہیں رکھا ہے۔

ہری دھن لاجواب ہوا، کوئی بات نہ سوجھی۔

بڑے نے پھر اسی لہجے میں کہا اگر تم چاہو کہ جنم بھر مہمان بنے رہو اور تمہارا ویسا ہی آدر ہوتا رہے تو یہ بات ہمارے بس کی نہیں ہے۔

ہری دھن نے آنکھیں نکال کر کہا کیا میں تم لوگوں سے کچھ کم کام کرتا ہوں۔

بڑے۔ یہ کون کہتا ہے۔

ہری۔ تو تمہارے گھر کی یہی ریت ہے کہ جو سب سے زیادہ کام کرے وہ بھوکوں مارا جائے، بڑے۔ تم خود کھانے نہیں گئے کیا کوئی تمہارے منہ میں ڈال دیتا۔

ہری۔ ہری نے ہونٹ چبا کر کہا میں خود کھانے نہیں گیا، کہتے تمہیں لاج نہیں آئی۔

بڑے۔ نہیں آئی تھی بہن تمہیں بلانے۔

ہری دھن کی آنکھوں میں خون اتر آیا دانت پیس کر رہ گیا۔

چھوٹے سالے نے کہا، اماں بھی تو آئی تھیں۔ تم نے کہہ دیا، مجھے بھوک نہیں ہے تو کیا کرتیں۔

ساس بھی اندر سے لپکی آ رہی تھی کتنا کہہ کر ہار گئی کوئی اٹھے نہ تو میں کیا کروں؟

ہری دھن نے زہر، خون اور آگ سے بھرے ہوئے لہجے میں کہا تو میں تمہارے لڑکوں کا جھوٹا کھانے کے لیے ہوں۔ میں کتا ہوں، کہ تم لوگ کھا کر میرے سامنے روکھی روٹی کا ٹکڑا ڈال دو۔

بڑھیا نے اینٹھ کر کہا، تو کیا تم میرے لڑکوں کی برابری کرو گے۔؟

ہری دھن شکست کھا گیا بڑھیا نے ایک جملہ کے وار سے اس کا کام تمام کر دیا۔ اس کی تنی ہوئی بھویں ڈھیلی پڑ گئیں، آنکھوں کی آگ مدھم پڑ گئی، پھڑکتے ہوئے نتھنے ساکت ہو گئے کسی چوٹ کھائے ہوئے آدمی کی طرح وہ زمین پر گر پڑا۔ کیا تم میرے لڑکوں کی برابری کرو گے؟ یہ جملہ ایک لمبے بھالے کی طرح اس کے دل میں چبھتا چلا جا رہا تھا، نہ دل کی حد تھی نہ بھالے کی انتہا۔

(۵)

کُل گھر نے کھایا مگر ہری دھن نہ اٹھا۔ ساس نے منایا، سالیوں نے منایا، خسر نے منایا۔ دونوں سالے منا کر رہ گئے مگر ہری دھن نہ اٹھا۔ وہیں دروازہ پر ایک ٹاٹ پڑا تھا اسے اٹھا کر سب سے الگ کنوئیں پر لے گیا اور جگت پر بچھا کر پڑ رہا۔

رات زیادہ جا چکی تھی، آسمان کی فضائے بسیط میں لامحدود ستارے لڑکوں کی طرح کھیل رہے تھے، کوئی ناچتا تھا، کوئی کودتا تھا، کوئی ہنستا تھا، کوئی آنکھیں بند کر کے پھر کھول دیتا تھا تھوڑی تھوڑی دیر میں کوئی کوئی بہادر لڑکا ایک لمحہ میں وسیع فضا کو پار کر جاتا اور نہ جانے کہاں جا کر چھُپ جاتا، ہری دھن کو اپنا بچپن یاد آیا جب وہ اسی طرح کھیلا کرتا تھا، اس کی بچپن کی یاد روشن ستاروں کی طرح چمک اٹھی، وہ اس کا چھوٹا سا گھر، وہ آم کا باغ جہاں وہ کیریاں چُنا کرتا تھا وہ میدان جہاں وہ کبڈی کھیلا کرتا تھا، سب اسے یاد آنے لگے پھر مامتا بھری ماں کی موہنی صورت اس کے سامنے آ کر کھڑی ہو گئی ان کی آنکھوں میں کتنا درد تھا کتنا رحم تھا اسے معلوم ہوا گویا ماں آنکھوں میں آنسو بھرے اسے سینہ سے لگا لینے کے لیے ہاتھ پھیلائے اس کی طرف چلی آ رہی ہے، وہ اس دل کش تصور میں محو ہو کر رہ گیا گویا ماں نے اسے سینے

سے لگالیا اور وہ محبت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیر رہی ہے وہ رونے لگا، زار و قطار رونے لگا۔ اسی خود فراموشی کی حالت میں اس کے منہ سے یہ الفاظ نکلے "اماں تم نے مجھے اتنا بھلا دیا دیکھو تمہارے پیارے لال کی کیا گت ہو رہی ہے کوئی اسے پانی کو بھی نہیں پوچھتا جہاں تم ہو وہاں میرے لیے جگہ نہیں ہے ؟

دفعتاً گمانی نے آکر پکارا، کیا سو گئے تم، چل کر کھا کیوں نہیں لیتے۔ کب تک کوئی تمہارے لیے بیٹھا رہے۔

ہری اٹھ بیٹھا اور ایک تلوار سی نیام سے نکال کر بولا، بھلا تمہیں میری سدھ تو آئی میں نے تو کہہ دیا تھا۔ مجھے بھوک نہیں ہے۔

گمانی۔ تو کے (کتنے) دن نہ کھاؤ گے ؟

ہری۔ اس گھر کا پانی نہ پیوں گا تمہیں میرے ساتھ چلنا ہے یا نہیں ؟ ان معمم ارادہ سے بھرے ہوئے الفاظ کو سن کر گمانی سہم اٹھی۔ بولی کہاں جا رہے ہو ؟ ہری نے گویا نشہ میں کہا تجھے اس سے کیا مطلب؟ میرے ساتھ چلے گی یا نہیں پھر پیچھے سے نہ کہنا کہ مجھ سے نہیں کہا۔

گمانی معترضانہ لہجے میں بولی تم بتاتے کیوں نہیں، کہاں جا رہے ہو ؟

"تو میرے ساتھ چلے گی یا نہیں ؟"

"جب تک تم نہ بتاؤ گے میں نہ جاؤں گی"

"تو معلوم ہو گیا تو نہیں جانا چاہتی، مجھے اتنا ہی پوچھنا تھا، نہیں تو میں اب تک آدھی دور نکل گیا ہوتا"۔

یہ کہہ کر وہ اُٹھا اور اپنے گھر کی طرف چل دیا۔ گمانی "سنو تو، سنو تو" پکارتی

رہی مگر اس نے پیچھے مڑ کر بھی نہ دیکھا۔

(۶)

تیس میل کی مسافت ہری دھن نے پانچ گھنٹہ میں طے کی، جب وہ اپنے گاؤں کے آم والے باغوں کے قریب پہنچا تو اس کا ماں کی یاد سے بھرا ہوا تخیل افق کی سنہری گود میں کھیل رہا تھا، ان درختوں کو دیکھ کر اس کا بے قرار دل ناچنے لگا، مندر کا سنہرا کلس دیکھ کر وہ اس طرح دوڑا گویا ایک ہی جست میں اس کے اوپر جا پہنچے گا، وہ تیزی سے دوڑا جا رہا تھا۔ گویا اس کی ماں آغوش کھولے ہوئے اسے بلا رہی ہو، جب وہ آموں کے باغ میں پہنچا جہاں ڈالیوں پر بیٹھنے سے اسے ہاتھی کی سواری کا مزہ ملتا تھا جہاں کے کچے بیر اور لسوڑوں میں ایک روحانی لذت تھی تو وہ بے اختیار بیٹھ گیا اور زمین پر سر جھکا کر رونے لگا گویا ماں کو اپنی مصیبت کی داستان سنا رہا ہو، وہاں کی ہوا میں وہاں کی روشنی میں گویا اس کی ماں کی ایک بڑی سی مورت بس رہی تھی، وہاں کی چپہ چپہ زمین ماں کے قدموں کے نشانات سے مقدس بنی ہوئی تھی۔ ماں کی محبت بھرے الفاظ گویا اب تک اس فضا میں گونج رہے تھے وہاں کی آب و ہوا میں نہ جانے کون سا امرت تھا جس نے اس کے افسردہ دل کو پھر سے امنگوں سے بھر دیا۔ وہ ایک درخت پر چڑھ گیا اور آم توڑ توڑ کر کھانے لگا۔ ساس کی وہ سخت کلامی بیوی کی وہ بے اعتنائی اور ساری ذلت، یہ سب باتیں وہ بھول گیا اس کے پاؤں پھول رہے تھے، تلوے جل رہے تھے، مگر اس مسرت کی محویت میں اسے کسی بات کا خیال نہ تھا۔

یکایک باغ کے رکھوالے نے پکارا، یہ کون اوپر چڑھا ہوا ہے رے؟ اتر ابھی نہیں تو ایسا پتھر کھینچ ماروں گا کہ وہیں ٹھنڈا ہو جائے گا۔

اس نے گالیاں بھی دیں مگر ان گالیوں میں ہری دھن کو بڑا لطف آرہا تھا۔ وہ ڈالیوں میں چھپ گیا اس نے کئی آم کاٹ کاٹ کر نیچے گرائے اور زور سے قہقہہ لگا کر ہنسا، ایسی خوشی سے بھری ہوئی ہنسی اس نے بہت دنوں سے نہ ہنسی تھی۔

رکھوالے کو یہ ہنسی کچھ پہچانی ہوئی سی معلوم ہوئی، مگر ہری دھن یہاں کہاں وہ تو سسرال کی روٹیاں توڑ رہا ہے، کیسا ہنسوڑ تھا، کتنا چلبلا، نہ جانے بے چارے کا کیا حال ہوا، پیڑ کی ڈال سے تالاب میں کود پڑتا تھا اب گاؤں میں ایسا کون ہے؟

ڈانٹ کر بولا وہاں سے بیٹھے بیٹھے ہنسو گے تو آکر ساری ہنسی نکال دوں گا۔ نہیں سیدھے سے اُتر آؤ۔

وہ گالیاں دینے ہی والا تھا کہ ایک گٹھلی آکر اس کے سر پر لگی وہ سر سہلاتا ہوا بولا یہ کون شیطان ہے، نہیں مانتا ٹھہر تو میں آکر تیری خبر لیتا ہوں اس نے اپنی لاٹھی نیچے رکھ دی اور بندروں کی طرح جھٹ اوپر چڑھ گیا دیکھا تو ہری دھن بیٹھا مسکرا رہا ہے، متحیّر ہو کر بولا، ارے ہری دھن تم یہاں کب آئے؟ اس پیڑ پر کب سے بیٹھے ہو؟

دونوں بچپن کے ساتھی وہیں گلے ملے۔

"یہاں کب آئے چلو گھر چلو بھلے آدمی! کیا وہاں آم بھی میسّر نہ ہوئے تھے۔"

ہری دھن نے مسکرا کر کہا، منگرو ان آموں میں جو سواد (لذّت) ہے وہ کہیں کے آموں میں نہیں۔ گاؤں کا کیا رنگ ڈھنگ ہے؟

منگرو۔ سب چین چان ہے بھیّا، تم نے تو جیسے ناتا ہی توڑ دیا اس طرح کوئی اپنا گاؤں گھر چھوڑ دیتا ہے جب سے تمہارے دادا مرے ساری گرہستی چوپٹ ہو گئی دو چھوٹے چھوٹے لڑکے ہیں ان کے کئے کیا ہوتا ہے۔

ہری دھن۔ مجھے اب اس گرہستی سے کیا واسطہ ہے بھائی میں تو اپنا لے دے چکا مجوری تو ملے گی نا! تمہاری گیا (گائیں) میں ہی چرا دیا کروں گا مجھے کھانے کو دے دینا۔

منگرو نے شکر کے لہجے میں کہا ارے بھیا کیسی باتیں کرتے ہو؟ تمہارے لئے جان تک حاضر ہے کیا سسرال میں اب نہ رہو گے؟ تو کوئی چنتا نہیں پہلے تو تمہارا گھر ہی ہے اسے سنبھالو۔ چھوٹے چھوٹے بچے ہیں ان کو پالو۔ تم نئی ماں سے ناہک (ناحق) ڈرتے تھے بڑی سیدھی ہیں بیچاری، بس اپنی ماں ہی سمجھو۔ تمہیں پاکر نہال ہی ہو جائیں گی اچھا گھر والی کو بھی تو لاؤ گے۔

ہری دھن۔ اس کا منہ اب نہ دیکھوں گا میرے لیے وہ مر گئی۔

منگرو۔ تو دوسری سگائی ہو جائے گی اب کے ایسی عورت لا دوں گا کہ اس کے پیر دھو دھو کے پیو گے پر کہیں پہلی آگئی تو؟

ہری دھن۔ وہ نہیں آئے گی۔

(۷)

اس گھر میں قدم رکھتے ہی ہری دھن کو ایسا دلی سکون کا احساس ہوا گویا وہ اپنی ماں کی گود میں بیٹھا ہوا ہے۔ اتنے دنوں تک ٹھوکریں کھانے سے اس کا دل نرم ہو گیا تھا جہاں پہلے گھمنڈ تھا، ضد تھی، شیخی تھی وہاں اب مایوسی تھی، شکست تھی اور طلب تھی، مرض کا زور گھٹ چلا تھا۔ اب اس پر معمولی دوا بھی اثر کر سکتی تھی، قلعہ کی دیواروں میں سوراخ ہو گئے تھے اب ان میں داخل ہو جانا مشکل نہ تھا۔ وہی گھر جس سے وہ ایک دن برداشتہ خاطر ہو چکا تھا، اب آغوش کھولے ہوئے اسے پناہ دینے کو تیار تھا، بے یار و مددگار ہری دھن اس سہارے کو پا کر مطمئن ہو گیا۔

شام کو اس کی سوتیلی ماں نے کہا بیٹا تم گھر آگئے ہمارے دھنیہ بھاگ اب ان بچّوں کو پالو ماں کا ناتا نہ سہی باپ کا ناتا تو ہے مجھے ایک روٹی دے دینا کھا کر ایک کونے میں پڑ رہوں گی، تمہاری ماں سے میرا بہن کا ناتا ہے اس ناتے سے بھی تم میرے لڑکے ہی ہوتے ہو۔

ماں کے لیے ترسنے والے ہری دھن کو سوتیلی ماں کے روپ میں اپنی ہی ماں کا درشن ہوا گھر کے ایک ایک گوشے میں ماں کی یاد کا جلوہ چاندنی کی طرح پھیلا ہوا تھا۔ وہی سوتیلی ماں کے چہرے پر بھی نظر آرہا تھا۔

دوسرے روز ہری دھن پھر کندھے پر ہل رکھے ہوئے کھیت کو چلا اس کے چہرے پر خوشی تھی اور اس کی آنکھوں میں غرور تھا وہ اب کسی کا سہارا لینے والا نہیں بلکہ سہارا دینے والا تھا، کسی کے در کا بھکاری نہیں بلکہ اپنے گھر کا نگہبان تھا۔

ایک روز اس نے سنا کہ گمانی دنے دوسرا شوہر کر لیا، وہ ماں سے بولا۔ تم نے سنا کاکی گمانی نے دوسرا گھر کر لیا۔

کاکی نے کہا۔ گھر کیا کرے گی ٹھٹھا ہے۔ برادری میں ایسا اندھیر، پنچایت نہیں عدالت تو ہے۔

ہری نے کہا نہیں کاکی بہت اچھا ہوا، لادَ مہابیر سوامی کو لڈو چڑھاؤں میں تو ڈر رہا تھا کہیں میرے گلے نہ آپڑے، بھگوان نے میری سن لی، میں وہاں سے اپنے من میں ٹھان کے چلا تھا کہ اب کبھی اس کا مُنہ نہ دیکھوں گا۔

بڑے بھائی صاحب

میرے بھائی صاحب مجھ سے پانچ سال بڑے تھے لیکن صرف تین درجے آگے۔ انھوں نے بھی اُسی عمر میں پڑھنا شروع کیا تھا لیکن تعلیم جیسے اہم معاملے میں وہ جلد بازی سے کام لینا پسند نہ کرتے تھے۔ اس عمارت کی بنیاد خوب مضبوط ڈالنا چاہتے تھے۔ ایک سال کا کام دو سال میں کرتے تھے۔ تاکہ عمارت پختہ ہو جائے۔

میں چھوٹا تھا، وہ بڑے تھے۔ میری عمر نو سال تھی، وہ چودہ سال کے تھے۔ انہیں میری تنبیہ اور نگرانی کا پورا اور پیدائشی حق تھا اور میری سعادت مندی اسی میں تھی کہ ان کے حکم کو قانون سمجھوں۔ وہ بڑے محنتی واقع ہوئے تھے۔ ہر وقت کتاب کھولے بیٹھے رہتے اور شاید دماغ کو آرام دینے کے لیے کبھی کاپی پر، کبھی کتاب کے حاشیوں پر چڑیوں، کتوں، بلیوں کی تصویریں بنایا کرتے، کبھی کبھی ایک ہی نام کو دس بیس بار خوش خط حروف میں نقل کرتے، کبھی ایسی عبارتیں لکھتے جن میں کوئی ربط نہ ہوتا، نہ کوئی معنی۔ مثلاً ایک بار ان کی

کاپی میں مَیں نے یہ عبارت دیکھی — اسپیشل، آئینہ، بھائیو، بھائیوں، دراصل، بھائی بھائی، رادھے شیام، شتری ہٹ رادھے شیام، ایک گھنٹے تک، اسکے بعد ایک انسان کا چہرہ تھا۔ میں نے ہر چند کوشش کی کہ اس عبارت میں کوئی معنی نکالوں، لیکن ناکام رہا۔ اور ان سے پوچھنے کی ہمت نہ پڑی۔ وہ نویں جماعت میں تھے۔ میں پانچویں جماعت میں ان کی تحریر سمجھنا میرے لیے چھوٹا مُنہ بڑی بات تھی۔

میرا جی پڑھنے میں بالکل نہ لگتا۔ ایک گھنٹہ بھی کتاب لے کر بیٹھنا بازِ خاطر تھا۔ موقع پاتے ہی ہاسٹل سے نکل کر میدان میں آجاتا اور کبھی کنکریاں اچھالتا، کبھی کاغذ کی تتلیاں اڑاتا، اور کہیں کوئی ساتھی مل گیا تو پوچھنا ہی کیا، کبھی چار دیواری پر چڑھ کر پیچھے کود رہے ہیں، کبھی پھاٹک پر سوار ہو کر موٹر کا لطف اٹھا رہے ہیں لیکن کمرے میں آتے ہی بھائی صاحب کی صورت دیکھ کر روح فنا ہو جاتی اور سارا مزہ کرکرا ہو جاتا پہلا سوال ہوتا، کہاں تھے؟ اس کا جواب خاموشی کے سوا میرے پاس اور کچھ نہ ہوتا۔ نہ جانے میری زبان سے یہ بات کیوں نہ نکلتی کہ ذرا باہر کھیل رہا تھا۔ میری خاموشی اعترافِ گناہ سمجھی جاتی اور بھائی صاحب بزرگانہ محبت اور تندی سے ملے ہوئے لہجے میں کہتے۔ اس طرح اگر انگریزی پڑھو گے تو زندگی بھر پڑھتے رہو گے اور ایک حرف نہ آئے گا۔ انگریزی پڑھنا کوئی ہنسی کھیل نہیں ہے جو چاہے پڑھ لے۔ اس طرح انگریزی آئی تو سبھی پڑھ لیتے۔ یہاں رات دن آنکھیں پھوڑنی پڑتی ہیں، خون جلانا پڑتا ہے، تب جا کر کہیں انگریزی آتی ہے اور میں کہتا ہوں تم کتنے کوڑھ مغز ہو کہ مجھے دیکھ کر بھی سبق نہیں لیتے۔ میں کتنی محنت کرتا ہوں۔ یہ تم اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہو۔ اگر نہیں دیکھتے تو یہ تمہارا قصور ہے، تمہاری عقل کا قصور ہے۔ اتنے میلے تماشے

ہوتے ہیں میں کبھی نہیں جاتا۔ روز کرکٹ اور ہاکی کے میچ ہوتے ہیں، میں قریب نہیں پھٹکتا، ہمیشہ پڑھتا رہتا ہوں۔ اس پر بھی دو دو، تین تین سال ایک ایک درجے میں پڑا رہتا ہوں۔ پھر تم کیسے امید کرتے ہو کہ تم یوں کھیل کود میں وقت گنوا کر پاس ہو جاؤ گے۔ مجھے دو ہی تین سال لگتے ہیں۔ تم ساری زندگی اسی درجے میں پڑے سڑتے رہو گے۔ اگر تمہیں اسی طرح عمر گنوانی ہے تو بہتر ہے گھر چلے جاؤ اور مزے سے گلی ڈنڈا کھیلو۔ دادا کی گاڑھی کمائی کے روپے کیوں برباد کرتے ہو۔

مَیں یہ پھٹکار سن کر آنسو بہانے لگتا۔ جواب ہی کیا تھا! بھائی صاحب کو نصیحت کے فن میں کمال تھا۔ ایسی ایسی لگتی باتیں کہتے تھے کہ میرے جگر کے ٹکڑے ہو جاتے اور ہمت لوٹ جاتی۔ اس طرح جان توڑ کر محنت کرنے کی طاقت مَیں اپنے میں نہ پاتا تھا اور ذرا دیر کے لیے مجھ پر مایوسی غالب آجاتی اور میں سوچتا کیوں نہ گھر چلا جاؤں؟ جو کام میرے بوتے کے باہر ہے اس میں ہاتھ ڈال کر کیوں اپنی زندگی خراب کروں۔ اس کے ساتھ ہی آئندہ سے خوب جی لگا کر پڑھنے کا ارادہ کرتا۔ ٹائم ٹیبل بناتا، صبح اٹھتا، منہ دھو کر ناشتہ کرتا، پھر انگریزی مطالعہ سات سے آٹھ تک حساب آٹھ سے نو تک، تاریخ نو سے ساڑھے نو تک، کھانا کھا کر اسکول جاتا، ساڑھے تین بجے سکول سے واپس، آدھ گھنٹہ تک آرام، پانچ تک جغرافیہ اور نقشہ، پانچ سے چھ تک گرامر، آدھ گھنٹہ آرام، چھ سے ساڑھے سات تک انگریزی کمپوزیشن، پھر کھانا کھا کر آٹھ سے نو تک انگریزی، نو سے دس تک اُردو، دس سے گیارہ تک متفرق مضامین۔ مگر ٹائم ٹیبل بنا لینا ایک بات تھی اس پر عمل کرنا دوسری بات پہلے ہی دن سے اس کی خلاف ورزی شروع ہو جاتی۔ میدان کی وہ فرحت انگیز ہوا، وہ دلاویز ہریالی

وہ پر لطف آزادی مجھے اضطراری طور پر کھینچ لے جاتی اور پھر بھائی صاحب کو نصیحت اور فضیحت کرنے کا موقع مل جاتا۔ میں ان کے سائے سے بھاگتا، ان کی نگاہوں سے دور رہنے کی کوشش کرتا۔ کمرے میں اس طرح دبے پاؤں آتا کہ انہیں خبر نہ ہو۔ ان کی نگاہ میری جانب اٹھی اور میری روح فنا ہوئی۔ ہمیشہ سر پر ایک برہنہ شمشیر سی لٹکتی معلوم ہوتی۔ کتابوں سے نفرت سی ہو جاتی تھی۔

(۲)

سالانہ امتحان ہوا۔ بھائی صاحب فیل ہو گئے۔ میں پاس ہو گیا اور درجے میں اوّل آیا۔ میرے اور ان کے درمیان صرف دو درجوں کا تفاوت رہ گیا۔ جی میں آیا بھائی صاحب کو آڑے ہاتھوں لوں۔ آپ کی وہ شبانہ روز کی دیدہ ریزی کہاں گئی۔ مجھے دیکھیے مزے سے کھیلتا بھی رہا اور درجے میں اوّل ہوں لیکن اس قدر پژمردہ اور شکستہ خاطر تھے کہ مجھے ان سے دلی ہمدردی ہوئی۔ اور ان کے زخم پر نمک چھڑکنے کا خیال ہی شرمناک معلوم ہوا۔ ہاں اب مجھے اپنے اوپر کچھ اعتماد پیدا ہوا اور بھائی صاحب کا وہ رعب مجھ پر نہ رہا۔ آزادی سے کھیل کود میں شریک ہونے لگا۔ دل مضبوط تھا۔ اگر انھوں نے پھر فضیحت کی تو صاف کہہ دوں گا آپ نے اپنا خون جلا کر کونسا تیر مار لیا۔ میں تو کھیلتے کودتے درجے میں اوّل آگیا۔ زبان سے یہ ہیکڑی جتانے کی ہمت نہ ہونے پر بھی میرے بشرے اور انداز سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ میں بھائی صاحب سے اب اتنا مرعوب نہیں ہوں۔ بھائی صاحب نے اسے بھانپ لیا اور ایک روز جب میں صبح کا سارا وقت گلی ڈنڈے کی نذر کر کے ٹھیک کھانے کے وقت لوٹا تو بھائی صاحب نے گویا میان سے تلوار کھینچ لی اور مجھ پر ٹوٹ پڑے۔ دیکھتا ہوں

امسال پاس ہوگئے اور درجے میں اوّل آگئے تو اب تمہیں دماغ ہوگیا ہے۔ مگر بھائی جان گھمنڈ تو بڑے بڑوں کا نہیں رہا تمہاری کیا ہستی ہے! تاریخ میں راون کا حال تو پڑھا ہی ہوگا۔ اس کی زندگی سے آخر تم نے کیا نتیجہ نکالا؟ یا یوں ہی پڑھ گئے محض امتحان پاس کر لینا تو کوئی بڑی چیز نہیں۔ اصل چیز ہے تاریخ سے سبق حاصل کرنا۔ راون ساری دنیا کا راجہ تھا۔ ایسے راجوں کو چکرورتی کہتے ہیں۔ آج کل انگریزوں کا راج بہت وسیع ہے مگر انہیں چکرورتی راجہ نہیں کہہ سکتے۔ راون چکرورتی راجہ تھا۔ بڑے بڑے دیوتا اس کی غلامی کرتے تھے۔ آگ اور پانی کے دیوتا بھی اس کے غلام تھے۔ مگر اس کا انجام کیا ہوا؟ غرور نے اس کا نام و نشان تک مٹا دیا۔ کوئی اسے چلّو پانی تک دینے والا نہ بچا۔ انسان اور چاہے جو برائی کرے۔ غرور کیا اور دین دنیا سے گیا۔ ابلیس کا حال بھی پڑھا ہوگا۔ اُسے بھی غرور ہوا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جنّت سے دوزخ میں دھکیل دیا گیا۔ شاہِ روم نے بھی ایک بار غرور کیا تھا۔ بھیک مانگ مانگ کر مر گیا۔ تم نے ابھی صرف ایک درجہ پاس کیا ہے اور ابھی سے سر پھر گیا۔ تب تو تم آگے بڑھ چکے۔ یہ سمجھ لو تم اپنی محنت سے پاس نہیں ہوئے اندھے کے ہاتھ بٹیر لگ گئی۔ مگر بٹیر صرف ایک بار ہاتھ لگ سکتی ہے، بار بار نہیں لگ سکتی کبھی کبھی گلی ڈنڈے میں بھی اندھے چوٹ نشانہ پڑ جاتا ہے۔ اس سے کوئی کامیاب کھلاڑی نہیں ہو جاتا۔ کامیاب کھلاڑی وہ ہے جس کا کوئی نشانہ خالی نہ پڑے۔ میرے فیل ہونے پر مت جاؤ۔ میرے درجے میں آؤ گے تو دانتوں پسینہ آجائے گا جب الجبرا اور جامیٹری کے لوہے کے چنے چبانے پڑیں گے اور انگلستان کی تاریخ پڑھنی پڑے گی۔ بادشاہوں کے نام یاد رکھنا آسان سمجھتے ہو؟ ہنری ساتویں کی جگہ ہنری

آٹھواں لکھا اور سب نمبر غائب۔ صفر بھی نہ ملے گا، صفر بھی۔ ہو کس خیال میں!
درجنوں تو جیمس ہوئے ہیں، درجنوں ولیم، کوڑیوں چارلس، دماغ چکر کھانے لگتا ہے۔ کمبختوں کو نام بھی نہ جڑتے تھے۔ ایک ہی نام کے پیچھے دوم، سوم، چہارم، پنجم لگاتے چلے گئے۔ اور جامیٹری تو بس خدا کی پناہ۔ و ب ج کی جگہ و ج ب لکھ دیا اور سارے نمبر کٹ گئے۔ کوئی ان بے رحم ممتحنوں سے نہیں پوچھتا کہ آخر و ب ج اور و ج ب میں کیا فرق ہے اور کیوں اس مہمل بات کے لیے طالب علموں کا خون کرتے ہو۔؟ دال، بھات روٹی اور دال روٹی بھارت میں کیا فرق ہے۔ مگر ممتحنوں کو کیا پروا؟ وہ تو وہی دیکھتے ہیں جو کتاب میں لکھا ہے۔ چاہتے ہیں کہ سب لڑکے رٹو طوطے ہو جائیں۔ اسی رٹنت کا نام تعلیم رکھ چھوڑا ہے، اور آخر ایسی بے سر پیر کی باتیں پڑھانے سے فائدہ ہی کیا؟ اس خط پر وہ عمود گرا دو تو قاعدہ عمود سے دگنا ہو گا۔ پوچھیے اس سے کیا مطلب؟ دگنا نہیں چوگنا ہو جائے اٹھ گنا ہو جائے، میری بلا سے، لیکن پڑھنا ہے تو یہ ساری باتیں یاد رکھنی پڑیں گی۔ انگریزی مضامین لکھنے پڑتے ہیں۔ کہہ دیا وقت کی پابندی پر ایک مضمون لکھو جو چار صفحے سے کم نہ ہو۔ اب کاپی کھول کر اس کے نام کو روئیے۔ کون نہیں جانتا کہ وقت کی پابندی اچھی بات ہے، لیکن اس پر چار صفحے کیسے لکھے؟ جو بات ایک جملے میں کہی جا سکے اس کے لیے چار صفحے لکھنے کی کیا ضرورت؟ میں تو اسے حماقت کہتا ہوں، مگر نہیں آپ کو چار صفحے لکھنے پڑیں گے، چاہیے جیسے لکھیے اور صفحے بھی پورے فل سکیپ سائز کے۔ یہ لڑکوں پر ستم ناروا نہیں ہے تو کیا ہے؟ ظالم اس پر یہ بھی کہے جاتے ہیں کہ اختصار سے کام لو۔ ایک ذرا سی بات پر تو آپ چار صفحے رنگواتے ہیں اور اس پر فرماتے ہیں کہ اختصار سے بھی کام لو۔ تیز بھی دوڑیے اور

آہستہ آہستہ بھی۔ ہے متضاد یا نہیں؟ بچہ بھی سمجھ سکتا ہے لیکن ان ماسٹروں کو اتنی بھی تمیز نہیں۔ اس پر دعویٰ ہے کہ ہم ماسٹر ہیں۔ میرے درجے میں آؤ گے تو یہ پاپڑ بیلنے پڑیں گے اور تب آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہو گا۔ اس درجے میں اول آگئے ہو تو اتنا اتراتے ہو۔ میرا کہنا مانیے۔ لاکھ فیل ہو گیا لیکن تم سے بڑا ہوں۔ دنیا کا تم سے زیادہ تجربہ حاصل کیا ہے۔ میرا کہنا مانو۔ جو کچھ کہتا ہوں اسے گرہ سے باندھ لو۔ ورنہ پچھتاؤ گے۔

اسکول کا وقت قریب تھا ورنہ خدا جانے یہ نصیحت کب ختم ہوتی۔ اب مجھے آج کھانا بالکل بے مزہ معلوم ہوا جب پاس ہو جانے پر یہ لتاڑ پڑتی ہے تو کہیں فیل ہو جاؤں تو یہ حضرت زندہ ہی نہ چھوڑیں گے۔ انھوں نے اپنے درجے کی پڑھائی کی جو ہیبت ناک تصویر کھینچی تھی۔ اس نے مجھے سچ مچ لرزا دیا۔ کیسے اسکول چھوڑ کر گھر نہیں بھاگا۔ یہی تعجب ہے۔ لیکن یہ سب درگت ہونے پر بھی کتابوں سے میری بے زاری بدستور قائم رہی۔ کھیل کود کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیتا۔ پڑھتا بھی تھا، مگر بہت کم بس اتنا کہ روز کا کام ختم ہو جائے اور درجے میں ذلیل نہ ہونا پڑے۔ اور پر جو اعتماد پیدا ہوا تھا، وہ پھر فنا ہو گیا اور پھر چوروں کی سی زندگی بسر ہونے لگی۔

(۳)

پھر سالانہ امتحان ہوا اور کچھ اتفاق ایسا ہوا کہ میں پھر پاس ہو گیا اور بڑے بھائی صاحب پھر فیل ہو گئے۔ میں نے محنت زیادہ نہیں کی مگر خدا جانے کیسے درجے میں اوّل آگیا؟ مجھے خود تعجب ہوا۔ بھائی صاحب نے حیرت انگیز محنت کی تھی۔ دس بجے رات تک، ادھر چار بجے صبح سے، پھر ادھر چھ سے ساڑھے نو تک اسکول جانے

قبل - چہرہ زرد ہو گیا مگر فیل - مجھے ان پر رحم آتا تھا۔ نتیجہ سنایا گیا تو وہ رو پڑے اور میں بھی رونے لگا۔

میرے اور بھائی صاحب کے درمیان اب ایک درجے کا تفاوت رہ گیا تھا۔ میرے دل میں ایک بے ہودہ خیال یہ پیدا ہوا کہ کہیں بھائی صاحب ایک سال اور فیل ہو جائیں تو میں ان کے برابر ہو جاؤں گا۔ پھر کس بنا پر میری نصیحت کر سکیں گے۔ لیکن میں نے اس خیال کو دل سے فوراً نکال دیا۔ آخر وہ مجھے ڈانٹتے ہیں تو میری ہی بھلائی کے لیے۔ مجھے اس وقت ناگوار لگتا ہے ضرور، مگر شاید ان کی تنبیہ کا ہی اثر ہو کر میں یوں دنا دن پاس ہوتا جاتا ہوں اور اتنے اچھے نمبروں سے۔

اب کے بھائی صاحب کچھ نرم پڑ گئے تھے۔ کئی بار مجھے ڈانٹنے کا موقع پا کر بھی صبر و تحمل سے کام لیا۔ شاید اب انھیں خود محسوس ہونے لگا تھا کہ یہ مجاز اب انھیں نہیں رہا۔ یا رہا تو بہت کم۔ میری بدمعاشی بھی بہت بڑھ گئی تھی۔ میں ان کے تحمل کا ناجائز فائدہ اٹھانے لگا۔ مجھے ایسا گمان ہوا کہ میں تو پاس ہو ہی جاؤں گا، پڑھوں یا نہ پڑھوں۔ میری تقدیر اچھی ہے۔ اس لئے بھائی صاحب کے خوف سے جو تھوڑا بہت کتابیں دیکھ لیا کرتا تھا وہ بھی جاتا رہا۔ مجھے کنکوے اڑانے کا نیا شوق پیدا ہو گیا تھا۔ اور اب زیادہ تر کیا بلکہ سارا وقت اسی مشغلے کی نذر ہوتا تھا۔ پھر بھی میں بھائی صاحب کا ادب کرتا تھا اور ان کی نظر بچا کر کنکوے اڑاتا تھا۔ ساری جزئیات درپیش عمل میں آتی تھیں۔ میں انھیں یہ گمان کرنے کا موقع نہ دینا چاہتا تھا کہ بھائی صاحب کی وقعت اور عزت میری نظروں میں کچھ کم ہو گئی ہے۔

ایک روز شام کے وقت ہاسٹل سے دور میں ایک کنکوا لوٹنے دوڑا جا رہا تھا

کہ بھائی صاحب سے میری مڈبھیڑ ہو گئی۔ شاید وہ بازار سے لوٹ رہے تھے۔ انھوں نے وہیں میرا ہاتھ پکڑ لیا، اور مجھے حقارت آمیز نظروں سے دیکھ کر بولے: ان بازاری لونڈوں کے ساتھ دھیلے کے کنکوے کے لیے دوڑتے تمہیں شرم نہیں آتی۔ تمہیں اس بات کا بھی کچھ لحاظ نہیں کہ اب نیچی جماعتوں میں نہیں ہو بلکہ آٹھویں جماعت میں آ گئے ہو۔ اور مجھ سے صرف ایک درجہ پیچھے ہو۔ آخر کچھ تو اپنی پوزیشن کا خیال کرنا چاہیے ایک وہ زمانہ تھا کہ لوگ آٹھواں درجہ پاس کر کے نائب تحصیلدار ہو جاتے تھے میں کتنے ہی مڈلچیوں کو جانتا ہوں جو آج اوّل درجے کے ڈپٹی کلکٹر یا سپرنٹنڈنٹ ہیں۔ کتنے ہی ہمارے لیڈر ہیں، بی۔اے۔ ایم۔ اے ولے ان کے ماتحت اور ان کے پیرو ہیں اور تم اسی آٹھویں درجے میں آکر بازاری لونڈوں کے ساتھ کنکوے کے لیے دوڑ رہے ہو۔ افسوس ہے تمہاری اس ناعقلی پر۔ تم ذہین ہو، اس میں شک نہیں، لیکن وہ دھن کس کام کی جس سے آدمی اپنا وقار کھو بیٹھے۔ تم اپنے دل میں سمجھتے ہو گے میں ان سے محض ایک درجہ پیچھے ہوں اور اب انہیں مجھ کو کچھ کہنے کا حق نہیں ہے۔ میں تمہارے اس خیال کو کبھی تسلیم نہیں کر سکتا۔ میں تم سے پانچ سال بڑا ہوں اور چاہے آج تم میری ہی جماعت میں آجاؤ۔ اور ممتحنوں کا یہی حال ہے تو یقیناً تم اگلے سال میرے ہم جماعت ہو جاؤ گے اور شاید ایک سال بعد مجھ سے آگے نکل جاؤ لیکن مجھ میں اور تم میں جو پانچ سال کا تفاوت ہے اسے تم کیا خدا بھی نہیں مٹا سکتا۔ میں تم سے پانچ سال بڑا ہوں اور ہمیشہ رہوں گا۔ مجھے دنیا اور زندگی کا جو تجربہ ہے تم اس کے برابر کبھی نہیں آسکو گے۔ چاہے تم ایم۔ اے اور ایل ایل ڈی ہی کیوں نہ ہو جاؤ۔ عقل کتابیں پڑھ لینے ہی سے نہیں آتی۔ ہماری اماں نے کوئی

درجہ پاس نہیں کیا اور دادا بھی شاید پانچویں چھٹی جماعت سے آگے نہیں گئے لیکن ہم دونوں آج ساری دنیا کا علم کیوں نہ پڑھ لیں، اماں اور دادا کو ہمیں تنبیہ کرنے کا ہمیشہ اختیار رہے گا، محض اس لیے نہیں کہ وہ بزرگ ہیں بلکہ اس لیے کہ وہ ہم سے زیادہ تجربہ کار ہیں اور رہیں گے۔ امریکہ میں کس طرح کی حکومت ہے اور ہنری ہشتم نے کتنی شادیاں کیں اور آسمان میں کتنے ستارے ہیں؟ یہ باتیں انھیں نہ معلوم ہوں لیکن ہزاروں ایسی باتیں ہیں جن کا علم انھیں ہم سے زیادہ ہے۔ آج میں خدانخواستہ بیمار ہو جاؤں تو تمہارے ہاتھ پاؤں پھول جائیں گے۔ سوائے دادا کو تار دینے کے تمہیں اور کچھ نہ سوجھے گا۔ لیکن تمہاری جگہ دادا ہوں گے تو کسی کو تار نہ دیں گے۔ بلکہ پہلے خود مرض کو پہچانیں گے۔ اور خود علاج کریں گے اور اگر اس میں کامیابی نہ ہوئی تو کسی ڈاکٹر کو بلائیں گے۔ گھبرائیں گے نہیں، بدحواس نہ ہوں گے، ہمارے خرچ کے لیے وہ جو کچھ بھیجتے ہیں اسے ہم بیس بائیس تاریخ تک خرچ کر کے پیسے پیسے کو محتاج ہو جاتے ہیں۔ ناشتہ بند کر دیتے ہیں، دھوبی اور نائی سے منہ چراتے ہیں لیکن آج جتنا ہم اور تم خرچ کر رہے ہیں اس کے نصف میں دادا نے اپنی زندگی کا بڑا حصہ عزت اور نیک نامی کے ساتھ بسر کیا ہے اور ایک کنبے کی پرورش کی ہے جس میں سب ملا کر نو آدمی تھے۔ یہ غرور دل سے نکال ڈالو کہ تم میرے قریب آ گئے اور اب خود مختار ہو۔ میرے دیکھتے تم کبھی اپنی زندگی برباد نہ کرنے پاؤ گے۔ میں جانتا ہوں تمہیں میری باتیں زہر لگ رہی ہیں۔

میں نے ان کی بزرگی کا احساس کرتے ہوئے اپنی ناسعادت مندی پر نادم ہو کر با چشم نم کہا: ہرگز نہیں۔ آپ جو کچھ فرما رہے ہیں وہ معقول ہے اور آپ

کو اس کے کہنے کا حق ہے۔ بھائی صاحب نے مجھے شفقت کی نظروں سے دیکھا اور مجھے گلے لگا لیا اور بولے میں کنکوے اڑانے کو منع نہیں کرتا۔ میرا جی بھی کبھی کبھی کنکوے اڑانے کو للچاتا ہے۔ کروں کیا، خود بے راہ چلوں تو تمہاری ہدایت کیسے کروں۔ یہ فرض تو میرے سر پر ہے۔

اتفاق سے اسی وقت ایک کنکوا ہمارے اوپر سے گزرا۔ اس کی ڈور لٹک رہی تھی۔ بھائی صاحب لمبے تھے۔ اچھل کر اس کی ڈور پکڑ لی اور اُسے لیے ہوئے ہاسٹل کی طرف دوڑے۔ میں پیچھے پیچھے دوڑ رہا تھا۔

پنچایت

جمّن شیخ اور الگو چودھری میں بڑا یارانہ تھا۔ ساجھے میں کھیتی ہوتی۔ لین دین میں بھی کچھ ساجھا تھا۔ ایک دوسرے پر کامل اعتماد، جمّن جب حج کرنے کو گئے تھے تو اپنا گھر الگو کو سونپ گئے تھے۔ اور الگو جب کبھی باہر جاتے تو جمّن پر اپنا گھر چھوڑ دیتے، وُہ نہ ہم نوالہ تھے نہ ہم پیالہ۔ نہ ہم مشرب صرف ہم خیال تھے۔ اور یہی دوستی کی اصلی بنیاد ہے۔

اس دوستی کا آغاز اسی زمانہ میں ہُوا۔ جب دونوں لڑکے جمّن کے پدر بزرگوار شیخ جمعراتی کے رُوبرُو زانوئے ادب تہ کرتے تھے الگو نے استاد کی بہت خدمت کی۔ خوب رکابیاں مانجھیں خوب پیالے دھوئے۔ ان کا حقّہ دم نہ لینے پاتا تھا۔ ان خدمتوں میں شاگردانہ عقیدت کے سوا اور کوئی بھی خیال مضمر تھا۔ اسے الگو خوب جانتے تھے۔ ان کے باپ پرانی وضع کے آدمی تھے۔ تعلیم کے مقابلہ میں انہیں استاد

کی خدمت پر زیادہ بھروسہ تھا۔ وُہ کہا کرتے تھے۔ استاد کی دعا چاہیے۔ جو کچھ ہوتا ہے۔ فیض سے ہوتا ہے۔ اور اگر الگو پر اُستاد کے فیض یا دعاؤں کا کچھ اثر نہ ہوا۔ تو اسے تسکین تھی کہ تحصیل علم کا کوئی دقیقہ اس نے فرد گزاشت نہیں کیا۔ علم اس کی تقدیر میں ہی نہ تھا۔ شیخ جمعراتی خود دعا اور فیض کے مقابلے میں تازیانہ کے زیادہ قائل تھے۔ اور جمّن پر اس کا بے دریغ استعمال کرتے تھے۔ اسی کا یہ فیض تھا کہ آج جمّن کی قرب وجوار کے مواضعات میں پرستش ہوتی تھی۔ اُن کے بیعنانہ یا رہن نامہ کے مسودات پر تحصیل کا عرائض نویس بھی قلم نہیں اٹھا سکتا تھا۔ حلقہ کا پوسٹ مین کانسٹیبل اور تحصیل کا مذکوری یہ سب اُن کے دستِ کرم کے محتاج تھے۔ اس لیے اگر الگو کو اُن کی ثروت نے ممتاز بنا دیا تھا۔ تو شیخ جمّن بھی علم کی لازوال دولت کے باعث وقار کی نگاہوں سے دیکھے جاتے تھے۔

(۲)

شیخ جمّن کی ایک بوڑھی بیوہ خالہ تھی۔ ان کے پاس تھوڑی سی ملکیت تھی مگر قریبی وارث کوئی نہ تھا۔ جمّن نے وعدے وعید کے سبز باغ دکھا کر خالہ اماں سے وہ ملکیت اپنے نام کروالی تھی۔ جب تک ہبہ نامہ پر رجسٹری نہ ہوئی تھی۔ خالہ جان کی خوب خاطر داریاں ہوتی تھیں۔ خوب میٹھے لقمے اور چٹ پٹے سالن کھلائے جاتے تھے۔ مگر رجسٹری کی مُہر ہوتے ہی ان خاطر داریوں پر بھی مُہر ہو گئی۔ وہ وعدے وصال کے وعدے ثابت ہوئے۔ جمّن کی اہلیہ بی فہمین نے روٹیوں کے ساتھ کچھ تیز تیکھی باتوں کے سالن بھی دینے شروع کیے اور رفتہ رفتہ سالن کی مقدار روٹیوں سے بڑھنے لگی۔ "بڑھیا عاقبت کے بوریے بٹورنے لگی گیا۔ دو تین بیگھے اوسر کیا دے

دیا ہے۔ گویا مول لے لیا ہے، بگھاری دال بغیر روٹیاں نہیں اترتیں جتنا روپیہ اس کے پیٹ میں جھونک چکے۔ اس سے تو اب تک کئی گاؤں مول لے لیتے۔" کچھ دنوں تک خالہ جان نے سُنا اور ضبط کیا۔ مگر جب برداشت نہ ہُوا تو جمّن سے شکایت کی۔ جمّن صلح پسند آدمی تھے۔ "مقامی" کارکن کے انتظام میں مداخلت کرنا مناسب نہ سمجھا۔ کچھ دن اور یونہی رو دھو کر کام چلا، آخر ایک دن خالہ جان نے جمّن سے کہا۔ "بیٹا! تمہارے ساتھ میرا نباہ نہ ہو گا۔ تم مجھے روپے دے دیا کرو میں اپنا الگ پکا لوں گی۔

جمن نے بے اعتنائی سے جواب دیا "روپیہ کیا یہاں پھلتا ہے" خالہ جان نے بگڑ کر کہا "تو مجھے کچھ نان نمک چاہیے یا نہیں؟"

جمّن نے مظلومانہ انداز سے جواب دیا "چاہیے کیوں نہیں۔ میرا خون چوس لو۔ کوئی یہ تھوڑے ہی سمجھا تھا کہ تم خواجہ خضر کی حیات لے کے آئی ہو۔"

خالہ جان اپنے مرنے کی بات نہیں سن سکتی تھیں۔ جامہ سے باہر ہو کر پنچایت کی دھمکی دی۔ جمّن ہنسے۔ وُہ فاتحانہ ہنسی جو شکاری کے لبوں پر ہرن کو جال کی طرف جاتے ہوئے دیکھ کر نظر آتی ہے۔ کہا ہاں ضرور پنچایت کرو۔ فیصلہ ہو جائے مجھے بھی رات دن کا دبال پسند نہیں۔

پنچایت کی صدا کس کے حق میں اُٹھے گی اِس کے متعلق شیخ جمّن کو اندیشہ نہیں تھا۔ قرب وجوار میں ایسا کون تھا جو ان کا شرمندۂ منت نہ ہو۔ کون تھا جو ان کی دشمنی کو حقیر سمجھے؟ کس میں اتنی جرأت تھی جو ان کے سامنے کھڑا ہو سکے، آسمان کے فرشتے تو پنچایت طلب کرنے آئیں گے نہیں۔ مریض نے خود ہی دوا طلب کی

(۳)

اس کے بعد کئی دن تک بوڑھی خالہ ہاتھ میں لکڑی لیے آس پاس کے گاؤں کے چکر لگاتی رہی۔ کمر جھک کر کمان ہو گئی تھی۔ ایک قدم چلنا مشکل تھا۔ مگر بات آ پڑی تھی۔ اس کا تصفیہ ضروری تھا۔ شیخ جمن کو اپنی طاقت، رسوخ اور منطق پر کامل اعتماد تھا۔ وہ کسی کے سامنے فریاد کرنے نہیں گئے۔

بوڑھی خالہ نے اپنی دانست میں گریہ وزاری کرنے میں کوئی کسر نہیں رکھی۔ مگر خوبیٔ تقدیر کوئی اس کی طرف مائل نہ ہوا۔ کسی نے تو یونہی ہاں ہوں کر کے ٹال دیا۔ کسی نے زخم پر نمک چھڑک دیا: "ذرا اس ہوس کو دیکھو! قبر میں پیر لٹکائے ہوئے ہیں۔ آج مریں۔ کل دوسرا دن ہوا۔ مگر صبر نہیں ہوتا۔ پوچھو اب تمہیں گھر بار۔ جگہ زمین سے کیا سروکار۔ ایک لقمہ کھاؤ۔ ٹھنڈا پانی پیو۔ اور مالک کی یاد کرو" سب سے بڑی تعداد ستم ظریفوں کی تھی۔ خمیدہ کمر۔ پوپلا منہ۔ سن کے سے سفید بال اور ثقل سماعت، جب اتنے تفریح کے سامان موجود ہوں تو ہنسی کا آنا ایک قدرتی امر ہے۔ غرض ایسے دردرس انصاف پرور آدمیوں کی تعداد بہت کم تھی جنہوں نے خالہ جان کی فریاد کو غور سے سنا ہو۔ اور اس کی تشفی کی ہو۔ چاروں طرف سے گھوم گھام کے بڑھیا الگو چودھری کے پاس آئی۔ لاٹھی ٹیک دی اور دم لے کر بولی۔ "بیٹا تم بھی چھن بھر کو میری پنچایت میں چلے آنا۔

الگو بے رخی سے بولے "مجھے بلا کے کیا کرو گی۔ کئی گاؤں کے آدمی تو آئیں ہی گے۔

خالہ نے ہانپ کر کہا "اپنی پھریاد تو سب کے کان میں ڈال آئی ہوں۔ آنے

نہ آنے کا حال اللہ جانے؟ ہمارے سپہ سالار گائے گی بارسن کر پیڑھی سے اٹھ آئے تھے۔ کیا میرا رونا کوئی نہ سنے گا؟"

الگو نے جواب دیا۔ "یوں آنے کو میں آجاؤں گا مگر پنچایت میں منہ نہ کھولوں گا۔"

خالہ نے حیرت سے پوچھا۔ "کیوں بیٹا؟"

الگو نے پیچھا چھڑانے کے لیے کہا۔ "اب اس کا کیا جواب؟ اپنی اپنی طبیعت۔ جمن میرے پرانے دوست ہیں۔ ان سے بگاڑ نہیں کر سکتا۔"

خالہ نے تاک نشانہ مارا۔ بیٹا کیا بگاڑ کے ڈر سے ایمان کی بات نہ کہوگے؟

ہمارے سوئے ہوئے ایمان کی ساری جھا چوری سے لٹ جائے اسے خبر نہیں ہوتی۔ مگر کھلی ہوئی للکار سن کر وہ چونک پڑتا ہے۔ اور ہوشیار ہو جاتا ہے۔ الگو چودھری اس سوال کا جواب نہ دے سکے۔ کیا وہ "نہیں" کہنے کی جرأت کر سکتے؟

(۴)

شام کو ایک پیڑ کے نیچے پنچایت بیٹھی۔ ٹاٹ بچھا ہوا تھا۔ حقہ پان کا بھی انتظام تھا۔ یہ سب شیخ جمن کی مہمان نوازی تھی، وہ خود الگو چودھری کے ساتھ ذرا دور بیٹھے ہوئے حقہ پی رہے تھے۔ جب کوئی آتا تھا۔ ایک دبی ہوئی سلام علیک سے اس کا خیر مقدم کرتے تھے۔ مگر تعجب تھا۔ کہ با اثر آدمیوں میں صرف وہی لوگ نظر آتے تھے۔ جنہیں ان کی رضا جوئی کی کوئی پرواہ نہ ہو سکتی تھی کئے مجلس کو دعوتِ احباب سمجھ کر جھنڈ کے جھنڈ جمع ہو گئے تھے۔

جب پنچایت پوری بیٹھ گئی تو بوڑھی جی نے حاضرین کو مخاطب کر کے کہا

"پنچو! آج تین سال ہوئے۔ میں نے اپنی سب جائیداد اپنے بھانجے جمّن کے نام لکھ دی تھی۔ اسے آپ لوگ جانتے ہوں گے۔ جمّن نے مجھے تاحین حیات روٹی کپڑا دینے کا وعدہ کیا تھا۔ سال چھ مہینے تو میں نے ان کے ساتھ کسی طرح رد دھوکر کاٹے۔ مگر اب مجھ سے رات دن کا رونا نہیں کہا جاتا۔ مجھے پیٹ کی روٹیاں تک نہیں ملتیں۔ بے کس بیوہ ہوں۔ تھانہ کچہری کر نہیں سکتی۔ سوائے تم لوگوں کے اور کس سے اپنا دکھ درد روؤں۔ تم جو راہ نکال دو۔ اس راہ چلوں۔ اگر میری بڑی دیکھو۔ میرے منہ پر تھپڑ مارو۔ جمّن کی برائی دیکھو تو اسے سمجھاؤ۔ کیوں ایک بے کس کی آہ لیتا ہے۔"

رام دھن مصر بولے۔ (ان کے کئی آسامیوں کو جمّن نے توڑ لیا تھا) "جمّن میاں! پنچ کسے بدتے ہو ابھی سے طے کر لو۔"

جمّن نے حاضرین پر ایک اُڑتی ہوئی نگاہ ڈالی۔ اپنے تئیں مخالفوں کے نرغہ میں پایا۔ دلیرانہ انداز سے کہا۔ "خالہ جان جسے چاہیں پنچ بنا دیں مجھے کوئی عذر نہیں ہے"

خالہ نے چلا کر کہا۔ "ارے اللہ کے بندے تو پنچوں کے نام کیوں نہیں بتا دیتا"

جمّن نے بڑھیا کو غضبناک نگاہوں سے دیکھ کر کہا۔ "اب اس وقت میری زبان نہ کھلواؤ۔ جسے چاہو پنچ بنا دو۔"

خالہ نے جمّن کے اعتراض کو تاڑ لیا۔ بولیں۔ "بیٹا خدا سے ڈر۔ میرے لیے کوئی اپنا ایمان نہ بیچے گا۔ اتنے بھلے آدمیوں میں کیا سب تیرے دشمن ہی دشمن ہیں؟ اچھا اور سب کو جانے دو۔ الگو چودھری کو تو مانے گا؟"

جمّن فرط مسرت سے باغ باغ ہو گئے۔ مگر ضبط کر کے بولے "الگو چودھری

ہی سہی۔ میرے لیے۔ جیسے رام دھن مصر ویسے الگو۔ کوئی میرا دشمن نہیں ہے۔"
الگو بغلیں جھانکنے لگا۔ اس جھمیلے میں نہیں پھنسنا چاہتے تھے۔ معترضانہ انداز سے کہا بوڑھی اماں! تم جانتی ہو۔ کہ میری اور جمّن کی گاڑھی دوستی ہے"؟
خالہ نے جواب دیا "بیٹا دوستی کے لیے کوئی اپنا ایمان نہیں کھوتا۔ پنچ کا حکم اللہ کا حکم ہے۔ پنچ کے منہ سے جو بات نکلتی ہے وہ اللہ کی طرف سے نکلتی ہے"۔
الگو کو کوئی چارہ نہ رہا۔ سرپنچ بنے۔ رام دھن مصر دل میں بڑھیا کو کوسنے لگے۔
الگو چودھری نے فرمایا "شیخ جمّن! ہم اور تم پرانے دوست ہیں۔ جب ضرورت پڑی ہے تم نے میری مدد کی ہے۔ اور ہم سے بھی جو بن پڑا ہے۔ تمہاری خدمت کرتے چلے آئے ہیں۔ مگر اس وقت نہ تم ہمارے دوست ہو۔ نہ ہم تمہارے دوست۔ یہ انصاف اور ایمان کا معاملہ ہے۔ خالہ جان نے پنچوں سے اپنا حال کہہ سنایا۔ تم کو بھی جو کچھ کہنا ہو کہو"۔
جمّن ایک شانِ فضیلت سے اُٹھ کھڑے ہوئے اور بولے۔ "پنچو! میں خالہ جان کو اپنی ماں کے بجائے سمجھتا ہوں اور ان کی خدمت میں کوئی کسر نہیں رکھتا ہاں عورتوں میں ذرا اَن بَن رہتی ہے۔ اس لیے میں مجبور ہوں۔ عورتوں کی تو یہ عادت ہی ہے۔ مگر ماہوار روپیہ دینا میرے قابو سے باہر ہے۔ کھیتوں کی جو حالت ہے۔ وہ کسی سے چھپی نہیں۔ آگے پنچوں کا حکم سر اور ماتھے پر ہے"۔
الگو چودھری کو آئے دن عدالت سے سابقہ رہتا تھا۔ قانونی آدمی تھے جمّن سے جرح کرنے لگے۔ ایک ایک سوال جمّن کے دل پر ہتوڑے کی ضرب کی طرح لگتا تھا۔ رام دھن مصر اور ان کے رفیق سر ہلا ہلا کر ان سوالوں کی داد دیتے تھے۔

جمّن حیرت میں تھے کہ الگو کو کیا ہو گیا ہے ابھی تو یہ میرے ساتھ بیٹھا کیسے مزے مزے کی باتیں کر رہا تھا۔ اتنی ہی دیر میں ایسی کایا پلٹ ہو گئی کہ میری جڑ کھودنے پر آمادہ ہے۔ اچھی دوستی نباہی! اس سے اچھے تو رام دھن ہی تھے۔ وہ یہ تو نہ جانتے تھے کہ کون کون سے کھیت کتنے پر اٹھتے ہیں۔ اور کیا نکاسی ہوتی ہے۔ ظالم نے بنا بنایا کھیل بگاڑ دیا۔

جرح ختم ہونے کے بعد الگو نے فیصلہ سنایا۔ لہجہ نہایت متین اور تحکمانہ تھا۔

"شیخ جمّن! پنچوں نے اس معاملہ پر اچھی طرح غور کیا۔ زیادتی سراسر تمہاری ہے کھیتوں سے معقول نفع ہوتا ہے۔ تمہیں چاہیے کہ خالہ جان کو ماہوار گزارے کا بندوبست کر دو۔ اس کے سوائے اور کوئی صورت نہیں اگر تمہیں یہ منظور نہیں تو ہبہ نامہ منسوخ ہو جائے گا۔"

جمّن نے فیصلہ سنا اور سناٹے میں آ گئے۔ احباب سے کہنے لگے "بھئی اس زمانے میں یہی دوستی ہے کہ جو اپنے اوپر بھروسہ کرے۔ اس کی گردن پر چھری پھیری جائے۔ اس کو نیرنگی روزگار کہتے ہیں۔ اگر لوگ ایسے دغا باز جو فروش گندم نما نہ ہوتے تو ملک پر یہ آفتیں کیوں آتیں۔ یہ ہیضہ اور پلیگ انہی مکاریوں کی سزا ہے۔"

مگر رام دھن مصر اور فتح خاں اور جگو سنگھ اس بے لاگ فیصلہ کی تعریف میں رطب اللسان تھے۔ "اس کا نام پنچایت ہے۔ دودھ کا دودھ پانی کا پانی۔ دوستی دوستی کی جگہ ہے۔ مقدم ایمان کا سلامت رکھنا ہے۔ ایسے سیتہ بادلیوں سے دنیا قائم ہے۔ ورنہ کب کی جہنم میں مل جاتی۔"

اس فیصلہ نے الگو اور جمّن کی دوستی کی جڑیں ہلا دیں۔ تناور درخت حق کا ایک

جھونکا بھی نہ سہہ سکا۔ وہ اب بھی ملتے تھے مگر نیزہ و سپر کی طرح۔ جمّن کے دل سے دوست کی غداری کا خیال دور نہ ہوتا تھا اور انتقام کی خواہش چین نہ لینے دیتی تھی۔

(۵)

خوش قسمتی سے موقعہ بھی جلد مل گیا۔ پچھلے سال الگو مصر بٹیر کے میلے سے بیلوں کی ایک اچھی گوئیں مول لائے تھے۔ پچھائیں نسل کے خوبصورت بیل تھے۔ مہینوں تک قرب و جوار کے لوگ انہیں دیکھنے آتے رہے۔

اس پنچایت کے ایک مہینے بعد۔ ایک بیل مر گیا۔ جمّن نے اپنے دوستوں سے کہا۔ یہ دغا بازی کی سزا ہے۔ انسان صبر کر جائے مگر خدا نیک و بد دیکھتا ہے۔ الگو کو اندیشہ ہوا کہ جمّن نے اسے زہر دلوا دیا ہے۔ اس کے برعکس چودھرائن کو خیال تھا کہ اس پر کچھ کرا دیا گیا ہے۔ چودھرائن اور بی فہمین میں ایک دن روز شور سے ٹھنی۔ دونوں خاتونوں نے روانی بیاں کی ندی بہا دی۔ تشبیہات اور استعاروں میں باتیں ہوئیں۔ بارے جمّن نے آگ بجھائی۔ بیوی کو ڈانٹا۔ اور رزمگاہ سے ہٹا لے گئے۔ ادھر الگو چودھری نے اپنے ڈنڈے سے چودھرائن کی شیریں کلامیوں کی داد دی۔

اب ایک بیل کس کام کا۔ اس کا جوڑا بہت ڈھونڈا مگر نہ ملا۔ ناچار اسے بیچ ڈالنے کی صلاح ہوئی۔ گاؤں میں ایک سمجھو سیٹھ تھا۔ وہ یکہ گاڑی ہانکتے تھے۔ گاؤں میں گڑ گھی بھرتے۔ اور منڈی لے جاتے۔ منڈی سے تیل نمک لاد کر لاتے۔ گاؤں میں بیچتے۔ اس بیل پر ان کی طبیعت لہرائی۔ سوچے اسے لے لوں۔ تو دن بھر بلا کسی منّت کے تین کھیوے ہوں۔ منہیں تو ایک ہی کے لالے رہتے ہیں۔ بیل دیکھا گاڑی

میں دوڑایا۔ بال بھنوری کی پہچان کرائی۔ مول بھاؤ کیا اور اپنے دروازے پر باندھ دیا۔ دام کے لیے ایک مہینے کا وعدہ ہوا۔ چودھری بھی غرض مند تھے۔ گھاٹے کی کچھ پرواہ نہ کی۔

سمجھو نے نیا بیل پایا تو پاؤں پھیلائے۔ دن میں تین تین چار چار کھیوے کرتا نہ چارے کی فکر تھی۔ نہ پانی کی۔ بس کھیوں سے کام تھا۔ منڈی لے گئے۔ وہاں کچھ سُوکھا بھوسہ ڈال دیا اور غریب جانور ابھی دم بھی نہ لینے پایا تھا کہ پھر جوت دیا۔ الگو چودھری کے یہاں تھے۔ تو چین کی بانسی بجتی تھی۔ راتب پاتے۔ صاف پانی۔ دلی ہوئی ارہر۔ بھوسہ کے ساتھ کھلی۔ کبھی کبھی گھی کا مزہ بھی مل جاتا۔ شام سویرے ایک آدمی کھریرے کرتا۔ بدن کھجلاتا۔ جھاڑتا پونچھتا۔ سہلاتا۔ کہاں یہ آٹھوں پہر کی رپٹ۔ مہینہ بھر میں بیچارے کا کچومر نکل گیا۔ یکہ کا جوا دیکھتے ہی بیچارے کا پیاؤ چھوٹ جاتا۔ ایک ایک قدم چلنا دوبھر تھا۔ ہڈیاں نکل آئی تھیں۔ لیکن اصیل جانور۔ مار کی تاب نہ تھی۔ ایک دن چوتھے کھیوے میں سیٹھ جی نے دونا بوجھ لادا۔ دن بھر کا تھکا جانور پیر مشکل سے اُٹھتے تھے۔ اس پر سیٹھ جی کوڑے رسید کرنے لگے بیل جگر توڑ کر چلا۔ کچھ دور دوڑا۔ چاہا کہ ذرا دم لوں۔ ادھر سیٹھ جی کو جلد گھر پہنچنے کی فکر۔ کئی کوڑے بڑی بے دردی سے لگائے۔ بیل نے ایک دفعہ پھر زور لگایا۔ مگر طاقت نے جواب دے دیا۔ زمین پر گر پڑا۔ اور ایسا گرا کہ پھر نہ اٹھا۔ سیٹھ نے بہت پیٹا۔ ٹانک پکڑ کر کھینچی۔ نتھنوں میں لکڑی کھونس دی۔ مگر لاش نہ اٹھی تب کچھ اندیشہ ہوا۔ غور سے دیکھا۔ بیل کو کھول کر الگ کیا۔ اور سوچنے لگے۔ کہ گاڑی گھر کیوں کر پہنچے۔ بہت چیخے اور چلائے مگر دیہات کا راستہ بچوں کی آنکھ ہے۔

سر شام سے بند۔ کوئی نظر نہ آیا۔ قریب کوئی گاؤں بھی نہ تھا۔ مارے غصے کے مرے ہوئے بیل پر اور درے لگائے۔ سسرے! تجھے مرنا تھا تو گھر پر مرتا تو نے آدھے راستے میں دانت نکال دیئے۔ اب گاڑی کون کھینچے۔ اس طرح خوب جلے بھنے۔ کئی بورے گڑ اور کئی کنستر گھی کے بیچے تھے۔ دو ڈھائی سو روپے کمر سے بندھے ہوئے تھے۔ گاڑی پر کئی درجے نمک کے تھے۔ دو ڈھائی سو روپے کمر سے بندھے ہوئے تھے۔ گاڑی پر لیٹ گئے۔ وہیں رات جگا کرنے کی ٹھان لی۔ اور آدھی رات تک نیند کو بہلاتے رہے۔ حقہ پیا۔ گایا۔ پھر حقہ پیا۔ آگ جلائی۔ تاپا۔ اپنی دانست میں تو وہ جاگتے ہی رہے۔ مگر جب پوپھٹی چونکے اور کمر پر ہاتھ رکھا۔ تو تھیلی ندارد۔ کلیجہ سن سے ہو گیا۔ کمر ٹٹولی۔ تھیلی کا پتہ نہ تھا۔ گھبرا کر ادھر اُدھر دیکھا کئی کنستر تیل کے بھی غائب تھے۔ سر پیٹ لیا۔ پچھاڑیں کھانے لگے۔ صبح کو بہزار خرابی گھر پہنچے۔

سیٹھانی جی نے یہ حادثہ سنا تو چھاتی پیٹ لی۔ پہلے خوب روئیں تب الگو چودھری کو گالیاں دینے لگیں۔ حفظِ ماتقدم کی سوجھی۔ نگوڑے نے ایسا منحوس بیل دیا کہ سارے جنم کی کمائی لٹ گئی۔

اس واقعہ کو کئی ماہ گزر گئے۔ الگو جب اپنے بیل کی قیمت مانگنے جاتے تو سیٹھ اور سیٹھانی دونوں جھلائے ہوئے کتوں کی طرح چڑھ بیٹھتے، یہاں تو سارے جنم کی کمائی مٹی میں مل گئی۔ فقیر ہو گئے۔ انہیں دام کی پڑی ہے۔ مردہ منحوس بیل تھا۔ اس پر دام مانگتے ہیں۔ آنکھ میں دھول جھونک دی۔ مرا ہوا بیل گلے باندھ دیا۔ نرا پونگا ہی سمجھ لیا ہے۔ کسی گڑھے میں منہ دھو آؤ۔ تب

دام لینا، صبر نہ ہوتا ہو تو ہمارا بیل کھول لے جاؤ۔ مہینے کے بدلے دو مہینے جوت لو اور کیا لوگے؟ اس فیاضانہ فیصلے کے قدر دان حضرات کی بھی کمی نہ تھی۔ اس طرح جھڑپ سن کر چودھری لوٹ آئے۔ مگر ڈیڑھ سو روپیہ سے اس طرح ہاتھ دھو لینا آسان کام نہ تھا۔ ایک بار وہ بھی بگڑے سیٹھ جی گرم پڑے۔ سیٹھانی جی جذبہ کے مارے گھر سے نکل پڑیں، سوال و جواب ہونے لگے۔ خوب مباحثہ ہوا۔ مجادلہ کی نوبت پہنچی۔ سیٹھ جی نے گھر میں گھس کر کواڑ بند کر لیے۔ گاؤں کے کئی معزز آدمی جمع ہو گئے۔ دونوں فریق کو سمجھایا۔ سیٹھ جی کو دلاسا دے کر گھر سے نکالا۔ اور صلاح دی کہ اس طرح آپس میں سر پھٹول سے کام نہ چلے گا۔ اس سے کیا فائدہ پنچایت کر لو۔ جو کچھ طے ہو جائے۔ اُسے مان جاؤ۔ سیٹھ جی راضی ہو گئے۔ الگو نے بھی حامی بھری فیصلہ ہو گیا۔

پنچایت کی تیاریاں ہونے لگیں، دونوں فریق نے غول بندیاں شروع کیں تیسرے دن اسی سایہ دار درخت کے نیچے پھر پنچایت بیٹھی۔

وہی شام کا وقت تھا۔ کھیتوں میں کوؤں کی پنچایت لگی ہوئی تھی۔ امر متنازعہ یہ تھا کہ مٹر کی پھلیوں پر ان کا جائز استحقاق ہے یا نہیں اور جب تک یہ مسئلہ طے نہ ہو جائے۔ وہ رکھوالے لڑکے کی فریاد بے داد پر اپنی بلاغت آمیز نارافسگی کا اظہار ضروری سمجھتے تھے۔

درختوں کی ڈالیوں پر طوطوں میں سرگرم مباحثہ ہو رہا تھا۔ بحث طلب یہ امر تھا کہ انسان کو انہیں من حیث القوم بے وفا کہنے کا کیا حق حاصل ہے۔

پنچایت پوری آ بیٹھی تو رام دھن مصر نے کہا "کیوں دیر کی جائے۔ بولو

چودھری کن کن آدمیوں کو پنچ بدتے ہو؟۔

الگو نے منکسرانہ انداز سے جواب دیا "سمجھو سیٹھ ہی چن لیں" سمجھو سیٹھ کھڑے ہوگئے۔ اور کڑک کر بولے "میری طرف سے شیخ جمّن کا نام لکھ لو"۔

الگو نے پہلا نام جمّن کا سنا اور کلیجہ دھک سے ہوگیا۔ گویا کسی نے اچانک تھپڑ مار دیا۔ رام دھن مصر الگو کے دوست تھے۔ تہ پر پہنچ گئے۔ بولے۔ چودھری تم کو کوئی عذر تو نہیں ہے۔"

چودھری نے مایوسانہ انداز سے جواب دیا " مجھے کوئی عذر نہیں ہے۔

اس کے بعد چار نام اور تجویز کیے گئے۔ الگو پہلا چرکہ کھا کر ہوشیار ہوگیا تھا۔ کہ اس مرحلہ کو کیوں کر طے کروں۔ کہ یکایک سمجھو سیٹھ کے ایک عزیز گودڑ شاہ بولے "سمجھو بھائی سرپنچ کسے بناتے ہو؟"۔

سمجھو کھڑے ہوگئے اور اکڑ کر بولے "شیخ جمّن کو"۔

رام دھن مصر نے چودھری کی طرف ہمدردانہ انداز سے دیکھ کر پوچھا "الگو تمہیں کچھ عذر ہو تو کہو"۔

الگو نے قسمت ٹھونک لی۔ حسرت ناک لہجہ میں بولے۔ "نہیں مجھے کوئی عذر نہیں ہے"۔

(۷)

اپنی ذمہ داریوں کا احساس اکثر ہماری تنگ ظرفیوں کا زبردست مصلح ہوتا ہے۔ اور گمراہی کے عالم میں معتبر راہنما۔

ایک اخبار نویس اپنے گوشہ عافیت میں بیٹھا ہوا مجلسِ وزرا کو کتنی بے باکی

اور آزادی سے اپنے تازیانہ قلم کا نشانہ بناتا ہے۔ مگر ایسے موقعے بھی آتے ہیں۔ جب وہ خود مجلسِ وزرا میں شریک ہوتا ہے۔ اس دائرہ میں قدم رکھتے ہی اس کی تحریر میں ایک دل پذیر متانت کا رنگ پیدا ہوتا ہے یہ ذمہ داری کا احساس ہے۔

ایک نوجوان عالمِ شباب میں کتنا بے فکر ہوتا ہے۔ والدین اسے مایوسانہ نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔ اسے ننگ خاندان سمجھتے ہیں۔ مگر تھوڑے ہی دنوں میں والدین کا سایہ سر سے اُٹھ جانے کے بعد وہی دارفتہ مزاج۔ ننگ خاندان کتنا سلامت رد کتنا محتاط ہو جاتا ہے۔ یہ ذمہ داری کا احساس ہے۔ یہ احساس ہماری نگاہوں کو وسیع کر دیتا ہے۔ مگر زبان کو محدود۔

شیخ جمن کو بھی اپنی عظیم الشان ذمہ داری کا احساس ہُوا۔ اس نے سوچا میں اس وقت انصاف کی اونچی مسند پر بیٹھا ہوں۔ میری آواز اس وقت حکم خدا ہے۔ اور خدا کے حکم میں میری نیت کو مطلق دخل نہ ہونا چاہیے۔ حق اور راستی سے جو بھر ٹلنا بھی مجھے دنیا اور دین دونوں ہی میں رُو سیاہ بنا دے گا۔

پنچایت شروع ہوئی۔ فریقین نے اپنے اپنے حالات بیان کیے جرح ہوئی شہادتیں گزریں۔ فریقین کے مددگاروں نے بہت کھینچ تان کی جمن نے بہت غور سے سُنا اور تب فیصلہ دیا۔

الگو چودھری اور سمجھو سیٹھ! پنچوں نے تمہارے معاملہ پر غور کیا۔ سمجھو کو بیل کی پوری قیمت دینا واجب ہے۔ جس وقت بیل ان کے گھر آیا۔ اس کو کوئی بیماری نہ تھی۔ اگر قیمت اسی وقت دے دی گئی ہوتی تو آج سمجھو اسے واپس لینے کا ہرگز تقاضا نہ کرتے۔

رام دھن مصر نے کہا "قیمت کے علاوہ ان سے کچھ تاوان بھی لیا جائے۔ سمجھو

نے بیل کو دوڑا دوڑا کر مارا ہے۔"

جمّن نے کہا "اس کا اصل معاملہ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔"

گوڈر شاہ نے کہا۔ "سمجھو کے ساتھ کچھ رعایت ہونی چاہیے۔ ان کا بہت نقصان ہوا ہے۔ اور اپنے کیے کی سزا مل چکی ہے۔"

جمّن بولے۔" اس کا بھی اس معاملہ سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ الگو چودھری کی بھل مانسی پر منحصر ہے۔"

یہ فیصلہ سنتے ہی الگو پھولے نہ سمائے۔ اٹھ کھڑے ہوئے اور زور سے ہانک لگائی۔ "پنچ پرمیشری کی جے۔"

آسمان پر تارے نکل آئے تھے۔ اس نعرہ کے ساتھ ان کی صدائے تحسین بھی سنائی دی۔ بہت مدھم گویا سمندر پار سے آئی ہو۔

ہر شخص جمّن کے انصاف کی داد دے رہا تھا۔ انصاف اس کو کہتے ہیں! آدمی کا یہ کام نہیں پنچ میں مانتا بستے ہیں۔ یہ ان کی مایا ہے۔ پنچ کے سامنے کھوٹے کو کھرا سنانا مشکل ہے۔

گھنٹہ بھر کے بعد جمّن شیخ الگو چودھری کے پاس آئے۔ اور ان کے گلے میں لپٹ کر بولے۔" بھیا! جب سے تم نے میری پنچایت کی ہے۔ میں دل سے تمہارا جانی دشمن تھا۔ مجھے آج معلوم ہوا کہ پنچایت کی مسند پر بیٹھ کر نہ کوئی کسی کا دوست ہوتا ہے نہ دشمن۔ انصاف کے سوا اور اسے کچھ نہیں سوجھتا۔ یہ بھی خدا کی شان ہے۔ آج مجھے یقین آگیا کہ پنچ کا حکم اللہ کا حکم ہے۔"

الگو رونے لگے۔ دل صاف ہو گئے۔ دوستی کا مرجھایا ہوا درخت پھر ہرا ہو گیا۔ اب وہ بالو کی زمین پر نہیں۔ حق اور انصاف کی زمین پر کھڑا تھا۔

ڈوبیل

جانوروں میں گدھا سب سے بے وقوف سمجھا جاتا ہے۔ ہم جب کسی شخص کو پرلے درجے کا احمق کہنا چاہتے ہیں تو اسے گدھا کہتے ہیں۔ گدھا واقعی بے وقوف ہے۔ یا اس کی سادہ لوحی اور انتہا درجہ کی قوت برداشت نے اسے یہ خطاب دلوایا ہے۔ اس کا تصفیہ نہیں ہو سکتا۔ گائے شریف جانور ہے۔ مگر سینگ مارتی ہے۔ کتا بھی غریب جانور ہے۔ لیکن کبھی کبھی اسے غصہ بھی آجاتا ہے۔ مگر گدھے کو کبھی غصہ نہیں آتا۔ جتنا جی چاہے مار لو۔ چاہے جیسی خراب سڑی ہوئی گھاس سامنے ڈال دو۔ اس کے چہرے پر ناراضگی کے آثار کبھی نظر نہ آئیں گے۔ اپریل میں شاید کبھی کلیل کر لیتا ہو۔ پر ہم نے اسے کبھی خوش ہوتے نہیں دیکھا۔ اس کے چہرے پر ایک مستقل مایوسی چھائی رہتی ہے۔ سکھ دکھ نفع نقصان سے کبھی اسے شاد ہوتے نہیں دیکھا۔ رشی منیوں کی جس قدر خوبیاں ہیں سب اس میں بدرجہ اتم موجود ہیں۔ لیکن آدمی اسے بیوقوف

کہتا ہے۔ اعلیٰ خصلتوں کی ایسی توہین ہم نے اور کہیں نہیں دیکھی، ممکن ہے دنیا میں سیدھے پن کے لیے جگہ نہ ہو۔

لیکن گدھے کا ایک بھائی اور بھی ہے جو اس سے کچھ ہی کم گدھا ہے اور وہ ہے بیل، جن معنوں میں ہم گدھے کا لفظ استعمال کرتے ہیں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں۔ جو بیل کو بے وقوفوں کا سردار کہنے کو تیار ہیں۔ مگر ہمارا خیال ایسا نہیں ہے۔ بیل کبھی کبھی مارتا ہے۔ کبھی کبھی اڑیل بیل بھی دیکھنے میں آتے ہیں۔ اور کبھی کئی طریقوں سے وہ اپنی ناپسندیدگی اور ناراضگی کا اظہار کر دیتا ہے۔ لہٰذا اس کا درجہ گدھے سے نیچے ہے

جھوری کاچھی کے پاس دو بیل تھے۔ ایک کا نام ہیرا تھا۔ اور دوسرے کا موتی۔ دونوں بچھائیں نسل کے تھے دیکھنے میں خوبصورت، کام میں چوکس۔ ڈیل ڈول میں اونچے، مہت دنوں سے ایک ساتھ رہتے رہتے دونوں میں محبت ہو گئی۔ دونوں آمنے سامنے یا ایک دوسرے کے پاس بیٹھے زبان خاموش میں ایک دوسرے سے بات چیت کیا کرتے تھے۔ وہ ایک دوسرے کے دل کی بات کیونکر سمجھ جاتے تھے۔ یہ ہم نہیں کہہ سکتے۔ ضرور ان میں کوئی ناقابلِ فہم قوت تھی۔ جس کے سمجھنے سے اشرف المخلوقات ہونے کا مدعی انسان محروم ہے۔ دونوں ایک دوسرے کو چاٹ کر اور سونگھ سے نہیں محض زندہ دلی سے۔ محض یعنی مذاق سے، جیسے یار دوستوں میں بھی کبھی کبھی دھول دھپا ہو جاتا ہے۔ اس کے بغیر دوستی کچھ پھیکی اور ہلکی سی رہتی ہے۔ جس پر زیادہ اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔ جس وقت یہ دونوں بیل ہل یا گاڑی میں جوتے جاتے اور گردنیں ہلا ہلا کر چلتے تو ہر ایک کی یہی کوشش ہوتی۔ کہ زیادہ بوجھ میری ہی گردن پر رہے۔ کام کے بعد دوپہر یا شام کو کھلتے تو ایک دوسرے کو چوم چاٹ

کر اپنی تکان اتار لیتے ، ناند میں کھلی بھوسہ پڑ جانے کے بعد دونوں ایک ساتھ اٹھتے ایک ساتھ ناند میں منہ ڈالتے ۔ اور ایک ساتھ ہی بیٹھتے ، ایک منہ ہٹا لیتا تو دوسرا بھی ہٹا لیتا تھا ۔

(۲)

ایک دفعہ جھوری نے دونوں بیل چند دنوں کے لیے اپنے سُسرال بھیجے ۔ بیلوں کو کیا معلوم ، وہ کیوں بھیجے جاتے ہیں ۔ سمجھے مالک نے ہمیں بیچ دیا ۔ کون جانے بیلوں کو اپنا بیچا جانا پسند آیا یا نہیں ۔ لیکن جھوری کے سالے کو انہیں اپنے گاؤں تک لے جانے میں دانتوں تلے پسینہ آگیا ، پیچھے سے ہانکتا تو دونوں دائیں بائیں بھاگتے ۔ آگے سے پکڑ کر کھینچتا تو دونوں پیچھے کو زور لگاتے ، مارتا تو دونوں سینگ نیچے کر کے پھنکارتے ۔ اگر ان بے زبانوں کی زبان ہوتی تو جھوری سے پوچھتے ۔ تم نے ہم غریبوں کو کیوں نکال دیا ۔ ہم نے تمہاری خدمت کرنے میں کوئی کوتاہی نہیں کی ۔ اگر اتنی محنت سے کام نہ چلتا تو اور کام لے لیتے ۔ ہم کو انکار نہ تھا ۔ ہمیں تمہاری خدمت میں مرجانا بھی قبول تھا ۔ ہم نے کبھی دانے چارے کی شکایت نہیں کی ۔ تم نے جو کچھ کھلایا سر جھکا کر کھا لیا ۔ پھر تم نے ہمیں اس ظالم کے ہاتھ کیوں بیچ دیا ۔

شام کے وقت دونوں بیل گیا کے گاؤں جا پہنچے ، دن بھر کے بھوکے تھے ، لیکن جب ناند میں لگائے گئے تو کسی نے بھی اس میں منہ نہ ڈالا ۔ دونوں کا دل بھاری ہو رہا تھا ۔ جسے اُنہوں نے اپنا گھر سمجھا تھا ۔ وہ آج ان سے چھوٹ گیا ۔ یہ نیا گھر ، نیا گاؤں نئے آدمی سب انہیں بیگانے سے لگتے تھے ۔ دونوں نے چپ کی زبان میں کچھ باتیں کیں ، ایک دوسرے کو کنکھیوں سے دیکھا ، اور لیٹ گئے جب

گاؤں میں سوتا پڑ گیا۔ تو دونوں نے زور مار کر پگھے تڑا لیے اور گھر کی طرف چلے، پگھے بہت مضبوط تھے۔ کسی کو شبہ بھی نہ ہو سکتا تھا کہ بیل انہیں توڑ سکیں گئے۔ پر ان دونوں میں اس وقت دوگنی طاقت آگئی تھی۔ ایک جھٹکے میں رسیاں ٹوٹ گئیں۔

جھوری نے صبح اٹھ کر دیکھا کہ دونوں بیل چرنے پر کھڑے تھے، دونوں کی گردن میں آدھا آدھا رسہ لٹک رہا تھا، گھٹنوں تک پاؤں کیچڑ میں بھرے ہوئے تھے۔ اور دونوں کی آنکھوں میں محبت اور نارضگی جھلک رہی تھی۔ جھوری ان کو دیکھ کر محبت سے باولا ہو گیا۔ اور دوڑ کر ان کے گلے سے لپٹ گیا۔ انسان اور حیوان کی محبت کا یہ منظر نہایت دلکش تھا۔

گھر اور گاؤں کے لڑکے جمع ہو گئے اور تالیاں بجا بجا کر ان کا خیر مقدم کرنے لگے۔ گاؤں کی تاریخ میں یہ واقعہ اپنی قسم کا پہلا نہ تھا۔ مگر اہم ضرور تھا۔ بال سبھا نے فیصلہ کیا، کہ ان دونوں بہادروں کو ایڈریس دیا جائے کوئی اپنے گھر سے روٹیاں لایا، کوئی گڑ، کوئی چوکر، کوئی بھوسی۔ ایک لڑکے نے کہا۔ "ایسے بیل اور کسی کے پاس نہ ہوں گے"۔ دوسرے نے تائید کی۔ "اتنی دور سے اکیلے چلے آئے"۔ تیسرا بولا "پچھلے جنم میں ضرور آدمی ہوں گے"۔

اس کی تردید کرنے کی کسی میں جرأت نہ تھی۔ سب نے کہا۔ "ہاں بھئی ضرور ہوں گے"

جھوری کی بیوی نے بیلوں کو دروازہ پر دیکھا، تو جل اٹھی۔ بولی "کیسے نمک حرام بیل ہیں"، ایک دن بھی وہاں کام نہ کیا بھاگ کھڑے ہوئے"۔

جھوری اپنے بیل پر یہ الزام برداشت نہ کر سکا۔ بولا "نمک حرام کیوں ہیں چارہ دانہ نہ دیا ہو گا، تو کیا کرتے"۔

عورت نے تنگ آکر کہا، "بس تمہیں بیلوں کو کھلانا جانتے ہو۔ اور تو سبھی پانی پلا پلا کر رکھتے ہیں۔"

جھوری نے چڑایا، "چارہ ملتا تو کیوں بھاگتے۔"

عورت چڑی "بھاگے اس لیے کہ وہ لوگ تم جیسے بدھوؤں کی طرح بیلوں کو سہلاتے نہیں۔ کھلاتے ہیں تو توڑ کر جوتتے ہیں۔ یہ دونوں ٹھہرے کام چور بھاگ نکلے، اب دیکھتی ہوں، کہاں سے کھلی اور چوکر آتا ہے۔ خشک بھوسے کے سوا کچھ نہ دوں گی۔ کھائیں چاہیں مریں۔"

وہی ہوا مزدور کو کڑی تاکید کر دی گئی۔ کہ بیلوں کو صرف خشک بھوسا دیا جائے۔ بیلوں نے ناند میں منہ ڈالا۔ تو پھیکا پھیکا، نہ چکنا ہٹ، نہ رس، کیا کھائیں پُر امید نگاہوں سے دروازہ کی طرف دیکھنے لگے۔

جھوری نے مزدور سے کہا۔ "تھوڑی سی کھلی کیوں نہیں ڈال دیتا بے!"

مزدور۔ مالکن مجھے مار ہی ڈالے گی۔

جھوری۔ ڈال دے تھوڑی سی۔

مزدور۔ نا دادا بعد میں تم بھی انہی کی سی سُنو گے۔

(۳)

دوسرے دن جھوری کا سالہ پھر آیا اور بیلوں کو لے چلا، اب کے اس نے دونوں کو گاڑی میں جوتا۔ دو چار مرتبہ موتی نے گاڑی کو کھائی میں گرانا چاہا۔ مگر ہیرا نے سنبھال لیا۔ اس وقت دونوں میں قوتِ برداشت زیادہ تھی۔

شام کے وقت گھر پہنچ کر گیا نے دونوں کو موٹی رسیوں سے باندھ دیا اور

کل کی شرارت کا مزہ چکھایا، پھر وہی خشک بھوسہ ڈال دیا۔ اپنے بیلوں کو کھلی چوناسب کچھ دیا۔

ہیرا اور موتی اس برتاؤ کے عادی نہ تھے۔ جھوری انہیں پھول کی چھڑی سے بھی نہ مارتا تھا۔ اس کی آواز پر دونوں اڑنے لگتے تھے۔ یہاں مار پڑی اس پر خشک بھوسا۔ ناند کی طرف آنکھ بھی نہ اُٹھائی۔

دوسرے دن گیا نے بیلوں کو ہل میں جوتا۔ پر ان دونوں نے جیسے پاؤں اٹھانے کی قسم کھالی تھی۔ وہ مارتے مارتے تھک گیا۔ مگر انہوں نے پاؤں نہ اٹھایا۔ ایک مرتبہ جب اس ظالم نے ہیرا کی ناک پر ڈنڈا جمایا۔ تو موتی غصہ کے مارے آپے سے باہر ہو گیا۔ ہل لے بھاگا۔ ہل رسی۔ جوا جوت سب ٹوٹ کر برابر ہو گئے۔ گلے میں بڑی بڑی رسیاں نہ ہوتیں، تو وہ دونوں نکل گئے تھے۔

ہیرا نے زبان خاموش سے کہا۔ "بھاگنا مشکل ہے"

موتی نے بھی نگاہوں سے جواب دیا "تمہاری تو اس نے جان لے لی تھی، اب کے بڑی مار پڑے گی"

ہیرا۔ پڑنے دو۔ بیل کا جنم لیا ہے تو مار سے کہاں بچیں گے۔ گیا دو آدمیوں کے ساتھ دوڑا آ رہا ہے۔ دونوں کے ہاتھوں میں لاٹھیاں ہیں

موتی۔ کہو تو میں بھی دکھا دوں کچھ مزہ۔

ہیرا۔ نہیں بھائی کھڑے ہو جاؤ۔

موتی۔ مجھے مارے گا۔ تو میں ایک آدھ کو گرا دوں گا۔

ہیرا۔ یہ ہمارا دھرم نہیں ہے۔

موتی دل میں اینٹھ کر رہ گیا۔ گیا آ پہنچا اور دونوں کو پکڑ کر لے چلا۔ خیریت ہوئی کہ اس نے اس وقت مار پیٹ نہ کی۔ نہیں موتی بھی تیار تھا، اس کے تیور دیکھ کر سہم گیا۔ اور اس کے ساتھی سمجھ گئے کہ اس وقت ٹال جانا ہی مصلحت ہے۔

آج دونوں کے سامنے پھر وہی خشک بھوسہ لایا گیا۔ دونوں چپ چاپ کھڑے رہے۔ گھر کے لوگ کھانا کھانے لگے۔ اسی وقت ایک چھوٹی سی لڑکی دو روٹیاں لے کر نکلی اور دونوں کے منہ میں دے کر چلی گئی، اس ایک ایک روٹی سے ان کی بھوک تو کیا مٹتی، مگر دونوں کے دل کو کھانا مل گیا۔ معلوم ہوا، یہاں بھی کوئی صاحب دل ہے۔ لڑکی گیا کی تھی، اس کی ماں مر چکی تھی، سوتیلی ماں اُسے مارتی تھی۔ اس لیے ان بیلوں سے اسے ہمدردی ہو گئی۔

دونوں دن بھر جوتے جاتے، اڑتے، ڈنڈے کھاتے، شام کو تھان پر باندھ دیئے جاتے اور رات کو وہی لڑکی انہیں ایک ایک روٹی دے جاتی۔ محبت کے اس کھانے کی یہ برکت تھی کہ دو چار خشک بھوسے کے لقمے کھا کر بھی دونوں کمزور نہ ہوتے تھے۔ مگر دونوں کی آنکھوں کی نس نس میں سرکشی بھری تھی۔

ایک دن چپ کی زبان میں موتی نے کہا "اب تو نہیں سہا جاتا ہیرا"۔ ہیرا کیا کرنا چاہتے ہو؟

موتی۔ گیا کو سینگ پر اٹھا کر پھینک دُوں؟

ہیرا۔ مگر وہ لڑکی اس کی بیٹی ہے۔ اسے مار گرا دو گے تو وہ یتیم ہو جائے گی۔

موتی۔ تو مالکن کو پھینک دُوں، وہ لڑکی کو ہر روز مارتی ہے۔

ہیرا۔ عورت کو مارو گی، بڑے بہادر ہو۔

موتی ۔ تم کسی طرح نکلنے ہی نہیں دیتے ۔ تو آؤ آج رسا تڑا کر بھاگ چلیں ۔

ہیرا ۔ ہاں یہ ٹھیک ہے ، ایسی موٹی رسی ٹوٹے گی کیونکر ۔

موتی ۔ پہلے رسی کو چبا لو ۔ پھر جھٹکا دے کر تڑا لو ۔

رات کو جب لڑکی روٹیاں دے کر چلی گئی تو دونوں رسیاں چبانے لگے ۔ پر موٹی رسی منہ میں نہ آتی تھی ۔ بچارے بار بار زور لگا کر رہ جاتے ۔

معاً گھر کا دروازہ کھلا اور وہی لڑکی نکلی دونوں سر جھکا کر اس کے ہاتھ چاٹنے لگے ۔ دونوں کی دمیں کھڑی ہو گئیں ، اس نے ان کی پیشانی سہلائی ۔ بولی ۔ "کھول دیتی ہوں ، بھاگ جاؤ ، نہیں یہ لوگ تمہیں مار ڈالیں گے ۔ آج گھر میں مشورہ ہو رہا ہے ۔ کہ تمہاری ناک میں ناتھ ڈال دی جائیں ۔" اس نے دونوں کے رسے کھول دیئے ، پر دونوں چپ چاپ کھڑے رہے ۔

موتی نے اپنی زبان میں پوچھا ۔ "اب چلتے کیوں نہیں ؟"

ہیرا نے جواب دیا ۔ "اس غریب پر آفت آجائے گی ۔ سب اسی پر شبہ کریں گے ۔"

یکایک لڑکی چلائی ، ارے دادا ! ارے دادا ! دونوں پھوپھا والے بیل بھاگے جا رہے ہیں ۔ دوڑو ۔ دونوں بیل بھاگے جا رہے ہیں ۔

گیا ۔ گھبرا کر باہر نکلا اور بیلوں کو پکڑنے چلا ۔ بیل بھاگے ۔ گیا نے پیچھا کیا ۔ وہ اور بھی تیز ہو گئے ، گیا نے شور مچایا ، پھر گاؤں کے کچھ اور آدمیوں کو لانے کے لیے لوٹا ، دونوں بیلوں کو بھاگنے کا موقعہ مل گیا ۔ سیدھے دوڑتے چلے گئے ۔ یہاں تک کہ رستہ کا خیال نہ رہا جس راہ سے یہاں آئے تھے ۔ اس کا پتہ نہ تھا ۔ نئے نئے گاؤں ملنے لگے ، تب دونوں ایک کھیت کے کنارے کھڑے ہو کر سوچنے لگے ۔ کہ "اب

کیا کرنا چاہیے۔"

ہیرا نے اپنی زبان میں کہا معلوم ہوتا ہے راستہ بھول گئے۔

موتی۔ تم بھی بے تحاشا بھاگے، وہیں اسے مار گراتے۔

ہیرا۔ اسے مار گراتے تو دنیا کیا کہتی، وُہ اپنا دھرم چھوڑ دے لیکن ہم اپنا دھرم کیوں چھوڑ دیں۔

دونوں بھوک سے بے حال ہو رہے تھے، کھیت میں مٹر کھڑی تھی چرنے لگے، رہ رہ کر آہٹ لے رہے تھے۔ کہ کوئی آتو نہیں رہا۔ جب پیٹ بھر گیا اور دونوں کو آزادی کا احساس ہُوا تو اچھلنے کودنے لگے۔ پہلے ڈکارلی پھر سینگ ملائے اور ایک دوسرے کو دھکیلنے لگے، موتی نے ہیرا کو کئی قدم پیچھے ہٹا دیا، یہاں تک کہ وہ ایک کھائی میں گر گیا۔ تب اسے بھی غصہ آیا۔ سنبھل کر اٹھا اور پھر موتی سے لڑنے لگا، موتی نے دیکھا، کھیل میں جھگڑا ہوا چاہتا ہے تو ایک طرف ہٹ گیا۔

(۴)

ارے یہ کیا! کوئی سانڈ ڈونکتا چلا آتا ہے۔ ہاں سانڈ ہی تو ہے۔ وہ سامنے آپہنچا، دونوں دوست تذبذب میں پڑ گئے۔ سانڈ پورا ہاتھی تھا۔ اس سے لڑنا جان سے ہاتھ دونا تھا۔ لیکن نہ لڑنے سے بھی جان بچتی نظر آتی تھی۔ انہیں کی طرف آرہا تھا۔ کتنا جسیم تھا۔

موتی نے کہا بُرے پھنسے، جان کیسے بچے گی، کوئی طریقہ سوچو۔

ہیرا نے کہا۔ غرور سے اندھا ہو رہا ہے۔ اِمنّت سماجت کبھی نہ سنے گا۔

موتی ۔ بھاگ کیوں نہ چلیں ۔

ہیرا ۔ بھاگنا پست ہمتی ہے ۔

موتی ۔ تو تم مہیں مرد ۔ بندہ نو دو گیارہ ہوتا ہے ۔

ہیرا ۔ اور جو دوڑ آئے پھر ــــ

موتی ۔ کوئی طریقہ بتاؤ ۔ لیکن ذرا جلدی ، وہ تو آ پہنچا ۔

ہیرا ۔ طریقہ یہی ہے کہ ہم دونوں ایک ساتھ حملہ کر دیں ۔ مَیں آگے سے دھکیلوں تم پیچھے سے دھکیلو ۔ دیکھتے دیکھتے بھاگ کھڑا ہو گا ۔ جونہی مجھ پر حملہ کرے ، تم پیٹ میں سینگ چبھو دینا ، جان جوکھوں کا کام ہے ۔ لیکن دوسرا کوئی طریقہ نہیں ۔

دونوں دوست جان ہتھیلیوں پر لے کر آگے بڑھے ۔ سانڈ کو کبھی منظم دشمن سے لڑنے کا اتفاق نہ ہُوا تھا ۔ وہ انفرادی جنگ کا عادی تھا جونہی ہیرا پر جھپٹا ، موتی نے پیچھے سے ہلہ بول دیا ، سانڈھ اس کی طرف مڑا تو ہیرا نے دھکیلنا شروع کر دیا ، سانڈھ چاہتا تھا ۔ ایک ایک کر کے دونوں کو گرا لے ، پر یہ بھی استاد تھے ۔ اسے یہ موقعہ ہی نہ دیتے تھے ۔ ایک دفعہ سانڈھ جھلّا کر ہیرا کو ہلاک کرنے چلا ۔ تو موتی نے بغل سے آکر اس کے پیٹ میں سینگ رکھ دیئے ، بے چارہ زخمی ہو کر بھاگا ۔ اور دونوں فتح یاب دوستوں نے دُور تک اس کا تعاقب کیا ۔ یہاں تک کہ سانڈھ بے دم ہو کر گر پڑا ۔ دونوں نے اس کا پیچھا چھوڑ دیا ۔

دونوں بیل فتح کے نشے میں جھومتے چلے جاتے تھے ۔ موتی نے اپنی اشاروں کی زبان میں کہا "میرا جی چاہتا تھا کہ بچّہ جی کو مار ہی ڈالوں ۔"

ہیرا ۔ گرے ہوئے دشمن پر سینگ چلانا نامناسب ہے ۔

موتی۔ یہ سب فضول ہے۔ اگر اس کا داؤ چلتا تو کبھی نہ چھوڑتا۔

ہیرا۔ اب گھر کیسے پہنچیں گے۔ یہ سوچو۔

موتی۔ پہلے کچھ کھالیں، تو سوچیں۔ ابھی تو عقل کام نہیں کرتی۔

یہ کہہ کر موتی مٹر کے کھیت میں گھس گیا۔ ہیرا منع کرتا ہی رہ گیا، لیکن اس نے ایک نہ سنی۔ ابھی دو چار ہی منہ مارے تھے کہ دو آدمی لاٹھیاں لیے آگئے اور دونوں بیلوں کو گھیر لیا۔ ہیرا تو مینڈ پر تھا نکل گیا۔ موتی کھیت میں تھا۔ اس کے سُم کیچڑ میں دھنسنے لگے نہ بھاگ سکا، پکڑا گیا، ہیرا نے دیکھا دوست تکلیف میں ہے تو لوٹ پڑا۔ پھنسیں گے تو دونوں اکھٹے ہی۔ رکھوالوں نے اُسے بھی پکڑ لیا۔

دوسرے دن دونوں دوست کانجی ہاؤس میں تھے۔

(۵)

ان کی زندگی میں یہ پہلا موقعہ تھا کہ سارا دن گزر گیا اور کھانے کو ایک تنکا بھی نہ ملا۔ سمجھ میں نہ آتا تھا، یہ کیسا مالک ہے۔ اس سے تو گیا ہی اچھا تھا۔ وہاں کئی بھینسیں تھیں، کئی گھوڑے، کئی گدھے مگر چارہ کسی کے سامنے بھی نہ تھا، سب زمین پر مُردے کی طرح پڑے تھے، کئی تو اس قدر کمزور ہو گئے تھے کہ کھڑے بھی نہ ہو سکتے تھے۔ سارے دن تو دونوں دوست دروازہ کی طرف دیکھتے رہے مگر کوئی چارہ لے کر نہ آیا، تب غریبوں نے دیوار کی مٹی چاٹنی شروع کی، مگر اس سے کیا تسکین ہو سکتی تھی۔

رات کو جب کھانا نہ ملا، تو ہیرا کے دل میں سرکشی کے خیالات پیدا ہوئے۔ موتی سے بولا۔ "مجھے تو معلوم ہوتا ہے جان نکل رہی ہے۔"

موتی ۔ اتنی جلدی ہمت نہ ہارو بھائی ! یہاں سے بھاگنے کا طریقہ سوچو ۔

ہیرا ۔ آؤ دیوار توڑ ڈالیں ۔

موتی ۔ مجھ سے تو اب کچھ نہ ہوگا ۔

ہیرا ۔ بس ۔ اسی بوتے پر اکڑتے تھے ۔

موتی ۔ ساری اکڑ نکل گئی بھیا !

باڑے کی دیوار کچی تھی ، ہیرا نے اپنے نوکیلے سینگ دیوار میں گاڑ دیئے اور زور مارا تو مٹی کا ایک چپڑ نکل آیا ۔ اس سے اس کا حوصلہ بڑھ گیا ۔ اس نے دوڑ دوڑ کر دیواروں سے ٹکریں ماریں ۔ ہر ٹکر میں تھوڑی تھوڑی مٹی گرنے لگی ۔

اتنے میں کانجی ہاؤس کا چوکیدار لالٹین لے کر جانوروں کی حاضری لینے آنکلا ہیرا کی وحشت دیکھ کر اس نے اُسے کئی ڈنڈے رسید کیے اور موٹی سی رسی سے باندھ دیا ، موتی نے پڑے پڑے اس کی طرف دیکھا ، گویا زبان حال سے کہا ۔ آخر مار کھائی ، کیا ملا ؟

ہیرا ۔ زور تو آزما لیا ۔

موتی ۔ ایسا زور مارنا کس کام کا بندھن پڑ گئے ۔

ہیرا ۔ اس سے باز نہ آؤں گا ۔ خواہ بندھن بڑھتے جائیں

موتی ۔ جان سے ہاتھ دھو بیٹھو گے ۔

ہیرا ۔ اس کی مجھے پرواہ نہیں ۔ یوں بھی تو مرنا ہی ہے ۔ ذرا سوچو اگر دیوار گر جاتی تو کتنی جانیں بچ جاتیں ۔ اتنے بھائی یہاں بند ہیں ۔ کسی کے جسم میں جان ہی نہیں ہے ۔ دو چار دن یہی حال رہا تو سب مر جائیں گے ۔

موتی ۔ ہاں یہ بات ہے ۔ تو لو پھر میں بھی زور لگاتا ہوں ۔

موتی نے بھی دیوار میں اسی جگہ سینگ مارا ۔ تھوڑی سی مٹی گری اور ہمت بڑھی تو وہ دیوار میں سینگ لگا کر اس طرح زور کرنے لگا ۔ جیسے کسی سے لڑ رہا ہو ۔ آخر کوئی دو گھنٹہ کی قوت آزمائی کے بعد دیوار کا کچھ حصہ گر گیا ۔ اس نے دگنی طاقت سے دوسرا دھکا لگایا ۔ تو آدھی دیوار گر پڑی ۔

دیوار کا گرنا تھا کہ نیم جان جانور اٹھ کھڑے ہو گئے ، تینوں گھوڑیاں بھاگ نکلیں ۔ بھیڑ بکریاں نکلیں ۔ اس کے بعد بھینس بھی کھسک گئیں ۔ پر گدھے ابھی کھڑے تھے ہیرا نے پوچھا "تم کیوں نہیں جاتے ؟"

ایک گدھے نے کہا کہیں پھر پکڑ لئے جائیں تو ۔

ہیرا ۔ پکڑ لیے جاؤ تو پھر دیکھا جائے گا ، اس وقت تو موقع ہے ۔

گدھا ۔ ہمیں ڈر لگتا ہے ۔ ہم نہ بھاگیں گے ۔

آدھی رات گزر چکی تھی ، دونوں گدھے کھڑے سوچ رہے تھے ۔ بھاگیں یا نہ بھاگیں ۔ موتی اپنے دوست کی رسی کاٹنے میں مصروف تھا ۔ جب وہ ہار گیا تو ہیرا نے کہا "تم جاؤ ۔ مجھے یہیں رہنے دو ، شاید کبھی ملاقات ہو جائے ۔"

موتی نے آنکھوں میں آنسو لا کر کہا ۔ "تم مجھے اتنا خود غرض سمجھتے ہو ۔ ہیرا ہم اور تم دونوں اتنے دنوں ساتھ رہے ۔ آج تم مصیبت میں پھنسے ہو تو میں چھوڑ کر بھاگ جاؤں !"

ہیرا ۔ بہت مار پڑے گی ، سمجھ جائیں گے ، یہ تمہاری شرارت ہے ۔

موتی ۔ جس قصور کے لیے تمہارے گلے میں رسا پڑا ہے ۔ اس کے لیے اگر مجھے

پر مار پڑے تو کیا بات ہے ۔ اتنا تو ہو گیا کہ نو دس جانوروں کی جان بچ گئی ۔
یہ کہہ کر موتی نے دونوں گدھوں کو سینگ مار مار کر باہر نکال دیا اور اپنے دوست کے پاس آکر سو گیا ۔

صبح ہوتے ہوتے منشیوں ، چوکیداروں اور دوسرے ملازموں میں کھلبلی مچ گئی ؛ اس کے بعد موتی کی مرمت ہوئی اور اسے بھی موٹی رسی کے ساتھ باندھ دیا گیا ۔

(۶)

ایک ہفتہ تک دونوں بیل بندھے پڑے رہے ۔ خدا جانے اس کانجی ہاؤس کے آدمی کیسے بے درد تھے ۔ کہ کسی نے چارے کا ایک تنکا تک نہ ڈالا ۔ ہاں ایک مرتبہ پانی دکھا دیا تھا ، یہی ان کی خوراک تھی ۔ دونوں اتنے کمزور ہو گئے کہ اٹھا تک نہ جاتا تھا ۔ ہڈیاں نکل آئیں ۔

ایک دن باڑے کے سامنے ڈگی بجنے لگی ۔ اور دوپہر ہوتے ہوتے وہاں پچاس ساٹھ آدمی جمع ہو گئے ۔ تب دونوں بیل نکالے گئے اور ان کی دیکھ بھال ہونے لگی ۔ لوگ آکر ان کی صورت دیکھتے تھے اور چلے جاتے تھے ، ایسے نیم جان بیلوں کو کون خریدتا ؟ معاً ایک آدمی جس کی آنکھیں سرخ تھیں اور جس کے چہرے پر سخت دلی کے آثار نمایاں تھے ۔ آیا اور منشی جی سے باتیں کرنے لگا ۔ اس کی شکل دیکھ کر کسی نامعلوم احساس سے دونوں کانپ اٹھے ۔ وہ کون ہے ۔ اور انہیں کیوں خریدتا ہے ۔ اس کے متعلق انہیں کوئی شبہ نہ رہا ۔ دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور سر جھکا لیا ۔

ہیرا نے کہا "گیا کے گھر سے ناحق بھاگے ۔ اب جان نہ بچے گی ۔"

موتی نے جواب دیا۔ "کہتے ہیں بھگوان سب پر مہربانی کرتے ہیں۔ انہیں ہماری حالت پر رحم کیوں نہیں آتا"۔

ہیرا۔ "بھگوان کے لیے ہمارا مرنا اور جینا دونوں برابر ہیں"۔

"چلو اچھا ہے۔ کچھ دن اس کے پاس رہیں گے"۔

"ایک مرتبہ بھگوان نے اس لڑکی کے روپ میں بچایا تھا۔ کیا اب نہ بچائیں گے"

موتی۔ یہ آدمی چھڑی چلائے گا۔ دیکھ لینا

ہیرا۔ معمولی بات ہے۔ مگر ان دکھوں سے چھوٹ جائیں گے۔

نیلام ہو جانے کے بعد دونوں بیل اس آدمی کے ساتھ چلے۔ دونوں کی بوٹی بوٹی کانپ رہی تھی۔ بچارے پاؤں تک نہ اٹھا سکتے تھے۔ مگر ڈر کے مارے چلے جاتے ذرا بھی آہستہ چلے تو وہ ڈنڈا جما دیتا تھا۔

راہ میں گائے بیلوں کا ایک ریوڑ مرغزار میں چلتا نظر آیا، سبھی جانور خوش تھے۔ کوئی اچھلتا تھا، کوئی بیٹھا جگالی کرتا تھا۔ کیسی پُرمسرت زندگی تھی۔ ان کی لیکن کیسے خود غرض تھے۔ کسی کو ان کی پرواہ نہ تھی۔ کسی کو خیال نہ تھا کہ ان کے دو بھائی موت کے پنجے میں گرفتار ہیں۔

معاً انہیں ایسا معلوم ہوا، کہ رستہ دیکھا ہوا ہے۔ ہاں ادھر ہی سے تو گیا ان کو اپنے گھر لے گیا تھا، وہی کھیت ہیں، وہی باغ ہیں۔ وہی گاؤں۔ اب ان کی رفتار تیز ہونے لگی، ساری تکان، ساری کمزوری، ساری مایوسی رفع ہو گئی۔ ارے یہ تو اپنا کھیت آگیا۔ یہ اپنا کنواں ہے۔ جہاں پر روز پانی پیا کرتے تھے۔

موتی نے کہا۔ ہمارا گھر نزدیک آگیا۔

ہیرا بولا۔ "بھگوان کی مہربانی ہے۔"

موتی ۔ میں تو اب گھر کو بھاگتا ہوں۔

ہیرا ۔ یہ جاتنے بھی دے گا اتنا سوچ لو

موتی۔ اسے میں گراتا ہوں۔ جب تک سنبھلے۔ تب تک ہم گھر جا پہنچیں گے۔

ہیرا ۔ نہیں۔ دوڑ کر تھان چلو۔ وہاں سے آگے نہ چلیں گے!

دونوں مست ہو کر بچھڑوں کی طرح کلیلیں کرتے ہوئے گھر کی طرف دوڑے اور اپنے تھان پر جا کر کھڑے ہو گئے۔ وہ آدمی بھی پیچھے پیچھے دوڑا آتا تھا۔

جھوری دروازے پر بیٹھا دھوپ کھا رہا تھا۔ بیلوں کو دیکھتے ہی دوڑا، اور انہیں پیار کرنے لگا۔ بیلوں کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ ایک..... جھوری کا ہاتھ چاٹ رہا تھا۔ دوسرا اس کا پیر۔

اس آدمی نے آکر بیلوں کی رسیاں پکڑ لیں۔ جھوری نے کہا۔ "یہ بیل میرے ہیں۔"

"تمہارے کیسے ہیں؟ میں نے نیلام میں لیا ہے۔"

جھوری۔ میرا خیال ہے چرا کر لائے ہو۔ چپکے سے چلے جاؤ۔

میرے بیل ہیں۔ میں بیچوں گا تو بکیں گے۔

کسی کو میرے بیل بیچنے کا کیا حق حاصل ہے۔"

"میں نے خریدے ہیں"

خریدے ہوں گے۔

اس پر آدمی زبردستی بیلوں کو لے جانے کے لیے آگے بڑھا۔ اسی وقت موتی نے سینگ چلایا۔ وہ آدمی پیچھے ہٹا۔ موتی نے تعاقب کیا۔ اور اسے

کھدیڑتا ہوا گاؤں کے باہر لے گیا۔ اور تب اس کا راستہ روک کر کھڑا ہو گیا۔ وہ آدمی دور کھڑا دھمکیاں دیتا تھا، گالیاں دیتا تھا، پتھر پھینکتا تھا۔ اور موتی اس کا راستہ روکے ہوئے تھا۔ گاؤں کے لوگ یہ تماشا دیکھتے تھے اور ہنستے تھے۔

جب وہ آدمی ہار کر چلا گیا تو موتی اکڑتا ہوا لوٹ آیا۔

ہیرا نے کہا "میں ڈر رہا تھا کہ کہیں تم اسے مار نہ بیٹھو۔"

موتی۔ اگر نزدیک آتا تو ضرور مارتا۔

ہیرا۔ اب نہ آئے گا۔

موتی۔ آئے گا، تو دور ہی سے خبر لوں گا۔ دیکھوں کیسے لے جاتا ہے؟

ذرا دیر بعد ناند میں کھلی، بھوسہ، چوکر دانہ سب کچھ بھر دیا گیا دونوں بیل کھانے لگے۔ جھوری کھڑا ان کی طرف دیکھتا تھا۔ اور خوش ہوتا تھا۔

اُسی وقت مالکن نے آکر اپنے بیلوں کے ماتھے چوم لیے۔

طلوعِ محبّت

بھوندو پسینہ میں شرابور لکڑیوں کا ایک گٹھا سر پر لیے آیا اور اسے پٹک کر بنٹی کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ گویا زبانِ حال سے پوچھ رہا تھا "کیا ابھی تک تیرا مزاج درست نہیں ہوا؟"

شام ہو گئی تھی۔ پھر بھی لو چلتی تھی اور آسمان پر گرد و غبار چھایا ہوا تھا۔ ساری قدرت دق کے مریض کی طرح نیم جان ہو رہی تھی۔ بھوندو صبح گھر سے نکلا تھا — دوپہر درخت کے سایہ تلے بسر کی تھی اور سمجھا تھا اس تیسا سے دیوی جی کا منہ ٹھیک ہو گیا ہو گا۔ لیکن آکر دیکھا تو وہ ابھی تک تنی بیٹھی تھی۔

بھوندو نے سلسلہ کلام شروع کرنے کی غرض سے کہا۔ "لا ایک پانی کا لوٹا دے دے۔ بڑی پیاس لگی ہے۔ مر گیا سارے دن میں، بجار جاؤں گا تو تین آنے سے بیشی نہ ملیں گے۔"

بنٹی نے سرکی کے اندر بیٹھے بیٹھے کہا "دھرم بھی لو لوٹ گے اور پیسے بھی۔ منہ دھو رکھو۔
بھوندو نے آنکھیں سکوڑ کر جواب دیا۔ "کیا دھرم دھرم بکتی ہے۔ دھرم کرنا ہنسی کھیل نہیں ہے۔ دھرم وہ کرتا ہے جس پر بھگوان کی مہربانی ہو۔ ہم دھرم کھاک کریں گے۔ پیٹ بھرنے کو چنا چینا تو ملتا نہیں دھرم کیا کریں گے۔"

بنٹی نے اپنا وار اوچھا پڑتے دیکھ کر چوٹ کی "دنیا میں کچھ ایسے دھرماتما بھی ہیں جو اپنا پیٹ چاہے نہ بھر سکیں۔ مگر پڑوسیوں کی دعوت کرتے پھرتے ہیں۔ ورنہ سارے دن بن بن کی لکڑیاں نہ کاٹتے پھرتے۔ ایسے دھرماتما لوگوں کو جورو رکھنے کی کیوں سوجھتی ہے۔ یہی میری سمجھ میں نہیں آتا —— دھرم چھکڑا کیا اکیلے نہیں چلتا؟"

بھوندو اس چوٹ سے تلملا اٹھا۔ اس کی رگیں تن گئیں۔ پیشانی پر بل پڑ گئے بنٹی کا منہ وہ ایک ڈپٹ میں بند کر سکتا تھا مگر اس نے یہ نہ سیکھا تھا۔ جس کی طاقت کی سارے کنجڑوں پر دھاک بیٹھی ہوئی تھی۔ جو تن تنہا سو پچاس جوانوں کا نشہ اتار سکتا تھا۔ وہ ایک کمزور عورت کے سامنے منہ نہ کھول سکا۔ دبی زبان سے بولا "جورو دھرم گنوانے کے لیے نہیں لائی جاتی، دھرم کمانے کے لیے لائی جاتی ہے۔"

یہ دونوں کنجڑ خاوند بیوی تین دن سے اور کئی کنجڑوں کے ساتھ اس باغ میں اترے ہوئے تھے۔ سارے باغ میں سرکیاں دکھائی دیتی تھیں۔ ان تین ہاتھ چوڑی اور چار ہاتھ لمبی سرکیوں کے ساتھ گزر اوقات کر رہا تھا۔ ایک طرف چکی تھی۔ ایک طرف باورچی خانہ کی اشیائ۔ ایک طرف اناج کے مٹکے دروازہ پر ایک کھٹولی بچوں کے لیے پڑی تھی۔ ہر ایک گھر کے ساتھ دو، دو بھینسے یا گدھے تھے۔ جب ڈیرا کوچ ہوتا تھا۔ تو سلا ساز وسامان ان گدھوں یا بھینسوں پر لاد دیا جاتا تھا۔ یہی ان کنجڑوں کی زندگی تھی۔

ساری بستی ایک ساتھ چلتی تھی۔ ایک ساتھ ٹھہرتی تھی۔ ان کی دنیا اسی بستی کے اندر تھی۔ آپس ہی میں شادی، بیاہ، لین دین، جھگڑے فیصلے ہوتے رہتے تھے۔ اس دنیا کے باہر سارا جہان ان کے لیے شکار گاہ تھا۔ ان کے کسی علاقہ میں پہنچتے ہی وہاں کی پولیس آکر انہیں نگرانی میں لے لیتی تھی۔ پڑاؤ کے ارد گرد چوکیداروں کا پہرہ لگ جاتا تھا۔ عورت یا مرد کسی گاؤں میں جاتے، تو پولیس کے آدمی ان کے ساتھ ہو لیتے۔ رات کو ان کی حاضری لی جاتی۔ پھر بھی گرد و نوح کے لوگ سہمے ہوئے تھے۔ کیونکہ کنجڑ لوگ اکثر گھروں میں گھس کر جو چیز چاہتے اٹھا لیتے۔ اور ان کے ہاتھ میں جاکر کوئی شے لوٹ نہ سکتی تھی۔ رات میں یہ لوگ اکثر چوری کرنے نکل جاتے۔ چوکیدار ان سے ڈرتے تھے۔ کیونکہ یہ لوگ خونخوار تھے۔ ذرا سی بات پر لڑنے مرنے کو تیار ہو جاتے۔ سختی کرنے میں جان کا خطرہ تھا۔ کیونکہ کنجڑ لوگ بھی ایک حد تک ہی پولیس کا دباؤ مانتے ہیں۔ ساری بستی میں بھوندو ہی ایک ایسا شخص تھا جو اپنی محنت کی کمائی کھاتا تھا۔ مگر اس لیے نہیں کہ وہ پولیس والوں سے خائف تھا۔ بلکہ اس لیے کہ اس کی بہادری یہ گوارا نہ کر سکتی تھی کہ وہ ناجائز طریقے سے اپنی کسی ضرورت کو پورا کرے۔

بنٹی کو شوہر کی یہ پاک دامنی ایک آنکھ نہ بھاتی تھی۔ اس کی بہنیں نئی نئی چوڑیاں اور نئے نئے زیور پہنیں تو بنٹی اپنے شوہر کی بزدلی پر کڑھتی تھی۔ اس بات پر دونوں میں کئی مرتبہ جھگڑے ہو چکے تھے۔ لیکن بھوندو اپنی عاقبت بگاڑنے کو تیار نہ ہوتا تھا۔ آج بھی صبح یہی سوال درپیش تھا اور بھوندو لکڑی کاٹنے جنگل نکل گیا تھا۔ کچھ مل جاتا تو بنٹی کی اشک شوئی ہو جاتی مگر آج سوائے لکڑی کے

کے اور کوئی شے نہ ملی۔ نہ کوئی جانور، نہ خس نہ جڑی بوٹی ——

بنٹی نے کہا "جن سے کچھ نہیں ہو سکتا۔ وہی دھرماتما بن جاتے ہیں۔ رانڈ اپنے مانڈ ہی میں خوش ہے۔"

بھوندو نے کہا "تو میں نکھٹو ہوں"

بنٹی نے اس سوال کا سیدھا جواب نہ دیا۔ "میں کیا جانوں۔ تم کیا ہو۔ میں تو یہ جانتی ہوں کہ یہاں دھیلے دھیلے کی چیز کے لیے ترسنا پڑتا ہے۔ یہاں جتنی عورتیں ہیں۔ سب کھاتی ہیں۔ پہنتی اوڑھتی ہیں۔ کیا میرے ہی دل نہیں ہے تمہارے ساتھ بیاہ کر کے جندگی کھراب ہو گئی۔"

بھوندو نے ایک لمحہ سوچ کر کہا "جانتی ہے۔ پکڑا گیا تو تین سال سے کم سجا نہ ہو گی۔"

بنٹی پر اثر نہ ہوا۔ بولی "جب اور لوگ نہیں پکڑے جاتے۔ تو تم ہی کیوں پکڑے جاؤ گے؟"

بھوندو۔ "اور لوگ پولیس کی کھدمے مدیں کرتے ہیں۔ چوکیداروں کے پاؤں سہلاتے ہیں۔ تو چاہتی ہے۔ میں بھی یہ کرم کروں۔"

بنٹی نے اپنی ضد نہ چھوڑی۔ بولی "میں تمہارے ساتھ سستی ہونے نہیں آئی پھر تمہارے چھرے گنڈاسے سے کوئی کہاں تک ڈرے۔ جانور کو بھی جب گھاس چارہ نہیں ملتا تو رسہ تڑا کر کسی کھیت میں جا گھستا ہے۔ میں تو آدمی ہوں۔"

بھوندو نے اس کا جواب نہ دیا۔ اس کی بیوی کوئی دوسرا گھر کر لے گی یہ خیال بھی اس کے لیے ناقابلِ برداشت تھا۔ آج بنٹی نے پہلی مرتبہ یہ دھمکی

دی۔ اب تک بھوندو اس کی طرف سے بے فکر تھا۔ اب یہ نیا خطرہ اس کے سامنے آکر کھڑا ہو گیا۔ وہ اپنی ساری زندگی میں ایسا روز سیاہ کبھی نہ آنے دے گا۔ اس کے لیے وہ سب کچھ کر گزرے گا۔ بھوندو کی نگاہوں میں بنٹی کی وہ عزت نہیں رہی، وہ اعتماد نہیں رہا۔ مضبوط دیوار کو ٹھکا دینے کی ضرورت نہیں ہوتی جب دیوار ہلنے لگتی ہے تو ہمیں اس کے سنبھالنے کی فکر ہوتی ہے۔ آج بھوندو کو اپنے گھر کی دیوار ہلتی ہوئی دکھائی دیتی تھی۔ آج تک بنٹی اس کی اپنی تھی۔ وہ جس طرح اپنی طرف سے بے پروا تھا۔ اس کی طرف سے بھی بے فکر تھا۔ وہ جس طرح خود رہتا تھا۔ اسی طرح اس کو رکھتا تھا۔ جو خود کھاتا تھا۔ وہی اسے کھلاتا تھا۔ اس کی کوئی خاص فکر نہ تھی۔ پر آج اسے معلوم ہوا کہ وہ اس کی اپنی نہیں ہے۔ اب اسے اس کی خاص طور پر دلجوئی کرنا ہوگی۔

آفتاب غروب ہو رہا تھا۔ اس نے دیکھا کہ اس کا گدھا چر کر چپ چاپ سر جھکائے چلا آرہا ہے۔ بھوندو نے کبھی اس کے کھانے پینے کی طرف دھیان نہ دیا تھا۔ آج بھوندو نے باہر آکر اسے پچکارا، اس کی پیٹھ سہلائی اور اسے پانی پلانے کے لیے ڈول اور رسی لے کر کنویں پر چلا گیا۔

(۲)

اس کے دوسرے ہی دن گاؤں کے ایک امیر ٹھاکر کے گھر چوری ہو گئی اس رات بھوندو اپنے ڈیرے پر نہ تھا۔ بنٹی نے چوکیدار سے کہا "کل جنگل سے نہیں لوٹا — صبح کے بھوندو آپہنچا۔ اس کی کمر میں روپوں کی ایک تھیلی تھی۔ کچھ سونے کے گہنے تھے۔ بنٹی نے گہنے ایک درخت کے نیچے گاڑ دیئے۔ روپوں کی کیا پہچان

ہو سکتی تھی۔

بھوندو نے پوچھا۔" اگر کوئی پوچھے۔ اتنے سارے روپے کہاں سے ملے تو کیا کہو گی؟"

بنٹی نے آنکھیں نچا کر کہا۔" کہہ دوں گی۔کیوں بتاؤں۔ دنیا کماتی ہے تو کسی کو حساب دینے جاتی ہے۔ہم اپنا حساب کیوں دیں؟"

بھوندو نے گردن ہلا کر کہا۔" یہ کہنے سے گلا نہ چھوٹے گا بنٹی! تو کہہ دینا۔ میں کئی مہینے سے تین تین چار چار روپے مہینہ بچاتی رہی ہوں، ہمارا خرچ ہی کون سا لمبا ہے۔"

دونوں نے مل کر کئی جواب سوچ لیے۔جڑی بوٹیاں بیچتے ہیں۔ ایک ایک جڑی کے کئی کئی روپے مل جاتے ہیں۔کھس، گھاس، جانوروں کی کھالیں، سب بیچتے ہیں۔

اس طرف سے بے فکر ہو کر دونوں بازار چلے۔ بنٹی نے اپنے لیے کئی قسم کے کپڑے، چوڑیاں، بندے، سیندور، پان، تمباکو، تیل اور مٹھائی لی۔ پھر دونوں شراب کی دکان پر گئے۔ خوب شراب پی اور دو بوتلیں رات کے لیے لے کر گھومتے پھرتے، گاتے بجاتے، گھڑی رات گئے ڈیرہ پر آئے۔ بنٹی کے پاؤں آج زمین پر نہ پڑتے تھے۔ آنے کے ساتھ ہی بن ٹھن کر پڑوسنوں کو اپنی چھب دکھانے چلی گئی۔

جب وہ لوٹ کر اپنے گھر گئی۔ اور کھانا پکانے لگی۔ تو پڑوسنوں نے تنقید کرنی شروع کر دی۔" کہیں گہرا ہاتھ مارا ہے۔"

"بڑا دھرماتما بنا پھرتا ہے۔"

"بگلا بھگت ہے۔"

"بنٹی تو جیسے آج ہوا میں اڑ رہی ہے۔"

"آج بھونڈو کی خاطر ہو رہی ہے۔ ورنہ کبھی ایک لٹیا پانی دینے بھی نہ اٹھتی تھی۔"

اس رات بھونڈو کو دیوی کی یاد آئی۔ آج تک اس نے کبھی دیوی کو بلیدان نہ دیا تھا۔ پولیس کو گانٹھنا کسی قدر مشکل تھا۔ کچھ خودداری بھی کھونی پڑتی تھی۔ دیوی صرف ایک بکرا لے کر خوش ہو جائے گی۔ ہاں اس سے ایک غلطی ضرور ہوئی تھی۔ اس کی برادری کے اور لوگ عام طور پر کوئی کام کرنے سے پہلے قربانی کرتے تھے۔ بھونڈو نے یہ خطرہ نہ لیا۔ جب تک مال ہاتھ نہ لگ جائے، اس میں سے دیوتاؤں کو کھلا دینا حماقت نہیں۔ تو اور کیا ہے۔ لوگوں سے اپنی چوری کو پوشیدہ رکھنا چاہتا تھا۔ اس لیے اس نے کسی کو خبر نہ دی۔ یہاں تک کہ بنٹی سے بھی نہ کہا۔ اور بکرے کی تلاش میں گھر سے نکلا۔

بنٹی نے پوچھا۔ "اب کھانے کے بکت کہاں چلے؟"

"ابھی آتا ہوں"

"مت جاؤ مجھے ڈر لگتا ہے۔"

بھونڈو نے محبت کے اس نئے اظہار پر خوش ہو کر کہا۔ "مجھے دیر نہ لگے گی۔ تو یہ گنڈاسا اپنے پاس رکھ لے"

اس نے گنڈاسا نکال کر بنٹی کے پاس رکھ دیا۔ اور باہر نکلا مگر بکرا کہاں

ملے۔ آخر اس مشکل کو بھی اس نے ایک خاص طریقے سے حل کیا۔ قریب کی بستی میں ایک گڈریے کے پاس کئی بکرے تھے۔ اس نے سوچا کہ وہاں سے ایک بکرا اٹھا لاؤں۔ دیوی کو اپنی قربانی سے غرض ہے۔ یا اس سے کہ بکرا کہاں سے آیا۔ اور کیوں آیا۔

لیکن بستی کے قریب پہنچا ہی تھا کہ پولیس کے چاروں آدمیوں نے اسے گرفتار کر لیا۔ اور مشکیں باندھ کر تھانے لے چلے۔

(۳)

بنٹی کھانا پکا کر بناؤ سنگار کرنے لگی۔ آج اسے اپنی زندگی گلزار معلوم ہوتی تھی۔ مسرت سے کھلی جاتی تھی۔ آج اپنی عمر میں پہلی مرتبہ اس کے سر میں خوشبودار تیل پڑا۔ اس کا آئینہ خراب ہو گیا تھا۔ اس میں اب منہ بھی دکھائی نہ دیتا تھا۔ آج وہ نیا آئینہ لائی تھی۔ اس کے سامنے بیٹھ کر اس نے بال سنوارے منہ پر ابٹن ملا۔ صابن لانا وہ بھول گئی تھی۔ صاحب لوگ صابن لگانے ہی سے تو گورے ہو جاتے ہیں۔ صابن ہوتا، تو اس کا رنگ بھی کچھ نکھر آتا۔ ایک ہی دن میں بالکل گوری تو نہ ہو جاتی۔ لیکن رنگ ایسا سیاہ بھی نہ رہتا۔ کل وہ صابن کی ٹکیاں ضرور خرید لائے گی۔ اور روز اس سے منہ دھوئے گی۔ بال سنوار کر اس نے ماتھے پر السی کا لعاب لگایا کہ بال ادھر اُدھر منتشر نہ ہو جائیں۔ پھر پان لگائے۔ چونا زیادہ ہو گیا تھا۔ اس لیے منہ میں چھالے پڑ گئے۔ لیکن اس نے سمجھا۔ شاید پان کھانے کا یہی مزہ ہے۔ آخر کڑوی مرچ بھی تو لوگ مزے مزے سے کھاتے ہی ہیں۔ گلابی رنگ کی ساڑھی پہن کر اور پھولوں کا ہار گلے میں

ڈال کر اس نے آئینہ میں اپنی صورت دیکھی تو اس کے آبنوس رنگ پر سرخی دوڑ گئی۔ اپنے آپ کو دیکھ کر شرما گئی۔ افلاس کی آگ میں نسائیت بھی جل کر خاک سیاہ ہو جاتی ہے۔ نسائیت کی حیا کا ذکر ہی کیا ہے۔ میلے کچیلے کپڑے پہن کر شرمانا ایسا ہی ہے۔ جیسے کوئی چنوں میں خوشبو لگا کر کھائے۔

اسی طرح بناؤ سنگار کر کے بنٹی بھونڈو کی راہ دیکھنے لگی۔ جب دیر ہو گئی۔ اور وہ نہ آیا تو اس پر جھنجھلا اٹھی۔ "روج تو سانجھ سے دروازے پر پڑے رہتے تھے۔ آج نہ جانے کہاں جا کر بیٹھ رہے۔" بنٹی کے سوکھے دل میں آج پانی پڑتے ہی اس کی نسائیت رگ آئی تھی۔ خفگی کے ساتھ اسے فکر بھی ہو رہی تھی۔ اس نے باہر نکل کر کئی مرتبہ پکارا۔ اس کی آواز میں ایسی شیرینی کبھی نہ تھی۔ اسے کئی مرتبہ شبہ ہوا کہ بھونڈو آ رہا ہے — وہ دوسری مرتبہ سرکی کے اندر دوڑ آئی اور آئینہ میں اپنا منہ دیکھا کہ کچھ بگڑ نہ گیا ہو۔ ایسی دھرکن، ایسی الجھن اسے آج تک کبھی نہ ہوئی تھی۔

بنٹی شوہر کے انتظار میں ساری رات بے قرار رہی۔ جوں جوں رات گزرتی جاتی تھی۔ اس کے اندیشے بڑھتے جاتے تھے۔ آج ہی اس کی پر لطف زندگی کا آغاز ہوا تھا۔ آج ہی یہ چال!

صبح جب وہ اٹھی تو ابھی کچھ اندھیرا ہی تھا۔ اس کا جسم شب بیداری سے ٹوٹ رہا تھا۔ آنکھوں سے آگ نکل رہی تھی۔ حلق خشک ہو رہا تھا۔ معاً کسی نے آکر "بنٹی رات بھونڈو پکڑا گیا"

بنٹی تھانے پہنچی تو پسینہ میں بھیگی ہوئی تھی اور دم پھول رہا تھا۔ اسے بھونڈو پر رحم نہ آتا تھا۔ غصہ آتا تھا۔ سارا زمانہ کام کرتا ہے اور چین کی بنسی بجاتا ہے۔ انہوں نے کہنے سننے پر ہاتھ بھی لگایا تو چوک گئے۔ شعور نہ تھا تو صاف کہہ دیتے کہ یہ کام مجھ سے نہ ہو گا۔ میں یہ تھوڑے ہی کہتی تھی کہ آگ میں کود پڑو۔

اسے دیکھتے ہی تھانیدار نے دھونس جمائی "یہی تو ہے بھونڈو کی عورت اسے بھی پکڑ لو۔"

بنٹی نے اکڑ کر کہا "ہاں ہاں پکڑ لو، یہاں کسی سے نہیں ڈرتے۔ جب ڈر کا کام نہیں کرتے تو ڈریں کیوں؟"

افسر اور ماتحت سب بنٹی کی طرف دیکھنے لگے — ان کا دل بھونڈو کی طرف سے کچھ نرم ہو گیا۔ اب تک وہ دھوپ میں کھڑا تھا۔ اب اسے سائے میں لے آئے۔ اس نے ایک مرتبہ بنٹی کی طرف دیکھا گویا کہہ رہا تھا "دیکھنا کہیں ان لوگوں کے دھوکے میں نہ آجانا۔"

تھانیدار نے ڈانٹ کر کہا "ذرا اس کی دیدہ دلیری تو دیکھو۔ جیسے پاکبازی کی دیوی ہی تو ہے۔ مگر اس پھیر میں نہ رہنا۔ میں تم لوگوں کی نس نس سے واقف ہوں۔ تین سال کے لیے بھجوا دوں گا۔ تین سال کے لیے۔ صاف صاف کہہ دو اور سارا مال لوٹا دو اسی میں خیریت ہے۔"

بھونڈو نے بیٹھے بیٹھے کہا "کیا کہہ دوں۔ جو لوگوں کو لوٹتے ہیں۔ ان سے تو کوئی کچھ نہیں کہتا۔ اور جو غریب محنت کی کمائی کھاتے ہیں۔ ان کا گلا

کاٹنے کو سبھی تیار ہو جاتے ہیں۔ ہمارا قصور صرف یہ ہے کہ ہمارے پاس کسی کو دینے دلانے کے لیے کچھ نہیں ہے۔"

تھانے دار نے سخت لہجہ میں کہا۔" ہاں ہاں! سکھا پڑھا دے بیوی کو کہ کہیں بھید نہ کھول دے۔ لیکن ان گیدڑ بھبھکیوں سے بچ نہیں سکتا۔ تو نے اقبال نہ کر لیا تو تین سال کے لیے جائے گا۔ میرا کیا بگڑتا ہے۔ ارے چھوٹے سنگھ اسے پکڑ کر کوٹھڑی میں بند کر دے۔"

بھونڈو نے بے پروائی سے کہا۔" داروگا ساب! بوٹی بوٹی کاٹ ڈالو مگر کچھ ہاتھ نہ لگے گا۔ آپ کی دھمکیوں کے آگے بڑے بڑے سیدھے ہو جاتے ہیں میں دوسری قسم کا آدمی ہوں۔"

داروغہ صاحب کو یقین ہو گیا کہ اس فولاد کا جھکنا دشوار ہے۔ بھونڈو کے بشرہ سے شہیدوں کا سا استقلال نظر آتا تھا۔ تھانے دار کا حکم پاتے ہی دو آدمیوں نے بھونڈو کو پکڑ کر کمرے میں بند کر دیا۔ شوہر کی بے بسی دیکھ کر بنٹی کا سینہ پھٹا جاتا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ کنجڑوں میں چوری کر کے اقبال کر لینا انتہا درجہ کی ذلت ہے۔ خدا جانے اس کا نتیجہ کیا ہو؟ خدا جانے کتنی سزا ہو جائے۔ ممکن ہے تین ہی سال کے لیے چلا جائے۔ جان پر کھیل کر بولی۔ "داروگا جی! تم سمجھتے ہو گے۔ ان گریبوں کی بیٹھ پر کوئی نہیں ہے۔ لیکن بھگوان تو سب کچھ دیکھتے ہیں۔ بھلا چاہو تو ان کو چھوڑ دو۔ کید ہو گئے تو میں کہیں کی نہ رہوں گی۔"

تھانے دار نے مسکرا کر کہا۔" تجھے کیا۔ یہ مر جائے گا۔ کسی اور سے بیاہ کر لینا

جو کچھ چوری کر کے لایا ہوگا۔ وہ تو تیرے ہی پاس ہوگا۔ کیوں نہیں اقبال کر کے چھڑا لیتی۔ میں وعدہ کرتا ہوں مقدمہ نہ چلاؤں گا۔ سب مال لوٹا دے۔ تو نے ہی منتر دیا ہوگا۔ گلابی ساڑھی اور پان اور خوشبودار تیل کے لیے تو ہی بے قرار ہو رہی ہوگی۔ اس پر مقدمہ چل رہا ہے اور سامنے کھڑی دیکھ رہی ہے عجیب عورت ہے۔"

بنٹی نے چند لمحے غور کیا۔ اور پھر سر جھکا کر آہستہ سے بولی۔" اچھا دارو گا ساب! میں سب کچھ دے دوں گی۔ ان پر حرف نہ آنے پائے۔"

(۵)

بھونڈو کو باہر نکالا گیا۔ تو اس نے خائف ہو کر پوچھا۔" کیوں کیا بات ہے"؟

ایک چوکیدار نے کہا۔" تیری عورت نے اقبال کر لیا ہے۔"

بھونڈو پہلی مرتبہ پھنسا تھا۔ اس کا سر چکر کھا رہا تھا۔ آواز بند سی ہو گئی تھی۔ لیکن یہ بات سنتے ہی جیسے وہ بیدار ہو گیا۔ اس نے دونوں مٹھیاں کس لیں۔ اور بولا۔" کیا کہا؟"

کیا کہا۔" چوری کھل گئی۔ داروغہ صاحب مال برآمد کرنے گئے ہیں۔ رات ہی اقبال کر لیتے تو یہ نوبت کاہے کو آتی۔"

بھونڈو نے گرج کر کہا۔" وہ جھوٹ بولتی ہے۔"

" وہاں مال بھی برآمد ہو گیا۔ تم ابھی تک اپنی ہی گا رہے ہو۔"

اپنے آباؤ اجداد کی وصفداری اپنے ہاتھوں خاک میں ملتے دیکھ کر بھونڈو کا سر جھک گیا۔ اس جگر سوز ذلت کے بعد اب اسے اپنی زندگی میں رسوائی اور

نفرت اور بے عزتی کے سوائے اور کوئی چیز دکھائی نہ دیتی تھی۔ اب اس نے سوچا وہ اپنی برادری میں کسی کو منہ نہ دکھا سکے گا۔

یکایک بنٹی آکر سامنے کھڑی ہو گئی۔ وہ کچھ کہنا چاہتی تھی کہ بھونددو کی خونخوار شکل دیکھ کر اسے بولنے کی جرأت نہ ہوئی۔ اسے دیکھتے ہی بھونددو کا مجروح خاندانی وقار کچلے ہوئے سانپ کی طرح تڑپ اٹھا۔ اس نے بنٹی کو آتشیں آنکھوں سے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں خون کی آگ جل رہی تھی۔ بنٹی سر سے پاؤں تک کانپ اٹھی اور الٹے پاؤں وہاں سے بھاگی۔

کسی دیوتا کے آہنی ہتھیاروں کی مانند وہ دونوں انگاروں کی سی آنکھیں اس کے دل میں چبھنے لگیں۔

تھانے سے نکل کر بنٹی نے سوچا۔ اب کہاں جاؤں؟ بھونددو اس کے ساتھ ہوتا تو وہ پردسنوں کے طعنے برداشت کر سکتی تھی۔ لیکن انگارے کی سی آنکھیں اس کے دل میں چبھی جاتی تھیں۔ لیکن کل کی عیش و آرام کی چیزوں کا پیار اسے ڈیرے کی طرف کھینچنے لگا۔ شراب کی بوتل اب بھی بھری رکھی تھی۔ پھلوڑیاں چھینکے پر ہانڈی میں پڑی تھیں۔ وہ تشنہ آرزوئیں جو موت کو سامنے دیکھ کر بھی دنیا کی نعمتوں کی طرف دل کو مائل کرتی ہیں۔ اسے کھینچ کر ڈیرے کی طرف لے چلیں۔

دوپہر کا وقت تھا۔ وہ پڑاؤ پر پہنچی۔ تو سناٹا چھایا ہوا تھا۔ ابھی کچھ دیر قبل جو جگہ رنگینی حیات سے گلزار بنی ہوئی تھی۔ اب وہاں سوائے ویرانے کے اور کچھ بھی نہ تھا۔ یہ برادری کا انتقام تھا۔ سب نے سمجھ لیا کہ بھونددو اب ہمارا آدمی نہیں۔ صرف اس کی سرکی ویرانے میں گویا روتی ہوئی کھڑی تھی۔ بنٹی نے اس

کے اندر پاؤں رکھا تو اس کی وہی حالت ہوئی جو خالی گھر کو دیکھ کر کسی چور کی ہوتی ہے۔ کون کون سی چیز اٹھائے۔ اس جھونپڑی میں اس نے رو رو کر پانچ برس کاٹے تھے۔ لیکن آج اسے اس سے وہ محبت پیدا ہو گئی تھی جو کسی ماں کے دل میں اپنے نالائق بیٹے کو دیکھ کر ہوتی ہے۔ جو برسوں کے بعد پردیس سے لوٹا ہو۔ ہوا سے کچھ اشیا اِدھر اُدھر ہو گئی تھیں۔ اس نے انہیں اٹھا کر ان کی جگہ پر رکھ دیا۔ پھلوڑیوں کی ہانڈی کچھ ہل گئی تھی۔ بنٹی کو شبہ ہوا کہ شاید اس پر کوئی بلی جھپٹی ہو۔ اس نے جلدی سے ہانڈی اتار کر دیکھا۔ پھلوڑیاں شاید کسی نے چھیڑی تھیں۔ پاؤں پر جو گیلا کپڑا لپٹا تھا۔ وہ خشک ہو گیا تھا۔ اس نے اس پر پانی چھڑک دیا۔

کسی کے پاؤں کی آہٹ پاکر اس کا کلیجہ دھک سے رہ گیا۔ بھونڈو آ رہا ہے۔ اس کی وہ انگارے کی سی آنکھیں! بنٹی کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ بھونڈو کے غصہ کا اسے ایک دو مرتبہ تجربہ ہو چکا تھا۔ لیکن اس نے دل کو مضبوط کیا۔ کیوں مارے گا۔ کچھ سنے گا۔ سوال جواب کرے گا۔ یونہی گنڈاسا چلا دے گا۔ اس نے اس کے ساتھ کوئی برائی نہیں کی۔ اسے آفت سے بچایا ہے۔ مرجاوا جان سے پیاری نہیں ہوتی۔ بھونڈو کو ہو گی۔ اسے نہیں ہے کیا اتنی سی بات پر وہ اس کی جان لے لے گا۔"

اس نے سرکی کے دروازے سے جھانک کر دیکھا۔ بھونڈو نہ تھا۔ اس کا گدھا آ رہا تھا۔ بنٹی آج اس بدبخت گدھے کو دیکھ کر ایسی خوش ہوئی جیسے اپنا بھائی میکے سے پتاشوں کی پوٹلی لیے تھکا ماندہ چلا آ رہا ہو۔ اس نے جا کر اس کی گردن سہلائی۔ اس کے تھوتھنے کو منہ سے لگا لیا۔ وہ اسے پھوٹی آنکھوں نہ

برقی کتب کی دنیا میں خوش آمدید

آپ ہمارے کتابی سلسلے کا حصہ بن سکتے ہیں

مزید اس طرح کی شان دار، مفید اور نایاب کتب

کے حصول کے لیے ہمارے واٹس ایپ گروپ کو

جوائن کریں

ایڈمن پینل :

محمد ثاقب ریاض : 03447227224

سدرہ طاہر : 03340120123

حسنین سیالوی : 03056406067

Imagitor

بھاتا تھا۔ پر آج اسے اپنا عزیز معلوم ہوتا تھا۔ وہ دونوں انگارے سی آنکھیں اسے گھور رہی تھیں۔ وہ پھر کانپ اٹھی۔

اس نے پھر سوچا۔ کیا کسی طرح نہ چھوڑے گا۔ وہ روتی ہوئی اس کے پیروں پر گر پڑے گی۔ کیا تب بھی نہ چھوڑے گا۔ ان آنکھوں کی وہ کتنی تعریف کیا کرتا تھا۔ کیا آج ان میں آنسو دیکھ کر بھی اسے رحم نہ آئے گا۔ بنٹی نے مٹی کے پیالے میں شراب انڈیل کر پی۔ اور پھلوڑیاں کھائیں۔ جب اسے مرنا ہی ہے۔ تو دل میں حسرت کیوں رہ جائے۔ وہ دونوں انگارے سی آنکھیں اب بھی اس کے سامنے تھیں۔ اس نے دوسرا پیالہ بھرا۔ اور وہ بھی پی گئی۔ زہریلا مٹھرا۔ جسے دوپہر کی گرمی نے اور بھی قاتل بنا دیا تھا۔ دیکھتے دیکھتے اس کے دماغ کو کھو لانے لگا۔ بوتل آدھی رہ گئی۔

اس نے سوچا۔ بھوندو پوچھے گا۔ تو نے اتنی دارو کیوں پی؟ تو وہ کیا کہے گی۔ کہہ دے گی۔ ہاں پی کیوں نہ پیئے۔ اسی کے لیے تو یہ سب کچھ ہوا۔ وہ ایک بوند نہ چھوڑے گی۔ جو ہونا ہے ہو جاتے۔ بھوندو اسے مار نہ سکے گا۔ وہ اتنا ظالم، اتنا کمینہ نہیں ہے۔ اس نے پھر پیالہ بھرا اور پی گئی۔ پانچ برس کی گزری ہوئی باتیں اسے یاد آنے لگیں۔ سینکڑوں مرتبہ دونوں میں لڑائیاں ہوئی تھیں — آج بنٹی کو ہر مرتبہ اپنی ہی زیادتی معلوم ہو رہی تھی — بیچارہ جو کچھ کماتا ہے۔ اسی کے ہاتھ پر رکھ دیتا ہے۔ اپنے لیے ایک پیسہ کا تمباکو بھی لیتا ہے تو پیسہ اسی سے مانگتا ہے۔ صبح سے شام تک بن بن پھرتا ہے۔ جو کام اس سے نہیں ہوتا۔ اسے کیوں کر کرے۔

معاً ایک کانسٹیبل نے آکر کہا" ارے بنٹی !کہاں ہے چل کر دیکھ بھوندو کا کیا حال ہے ۔ بے حال ہو رہا ہے ۔ ابھی تک تو چپ چاپ بیٹھا تھا ۔ پھر نہ جانے کیا جی میں آیا کہ ایک پتھر پر سر پٹک دیا ۔ سر سے لہو بہہ رہا ہے ۔ ہم لوگ دوڑ کر پکڑ نہ لیتے تو جان ہی دے دی تھی ۔

(۶)

ایک ہفتہ گزر گیا ۔ شام کا وقت تھا ۔ کالی کالی گھٹائیں چھائی ہوئی تھیں ۔ موسلا دھار برکھا ہو رہی تھی ۔ بھوندو کی سر کی اب بھی اس ویران میں کھڑی تھی ۔ بھوندو کھٹولی پر پڑا تھا ۔ اس کا چہرہ زرد پڑا تھا ۔ اور جسم مرجھا گیا تھا ۔ وہ فکر مندانہ انداز سے بارش کی طرف دیکھتا ہے ، چاہتا ہے ۔ اٹھ کر باہر دیکھوں مگر اٹھا نہیں جاتا ۔

بنٹی سر پر گھاس کی گٹھڑی لیے پانی میں شرابور آتی دکھائی دی ۔ وہی گلابی ساڑھی ، مگر تار تار ۔ لیکن اس کا چہرہ کھلا ہوا ہے ۔ رنج و افسوس کی جگہ اس کی آنکھوں سے محبت ٹپک رہی ہے ۔ چال ایسی مستانہ ہے اور آنکھیں ایسی چمکتی ہیں کہ دیکھ کر جی خوش ہو جائے ۔ بھوندو نے آہستہ آہستہ کہا :" تو اتنی بھیگ رہی ہے کہیں بیمار پڑ گئی تو کوئی ایک گھونٹ پانی دینے والا بھی نہ رہے گا ۔ میں کہتا ہوں تو اتنا کیوں مرتی ہے ۔ دو گٹھے تو بیچ چکی تھی ۔ اب یہ تیسرا گٹھا لانے کی کیا ضرورت تھی ۔ یہ ہانڈی میں کیا لائی ہے ؟"

بنٹی نے ہانڈی کو چھپاتے ہوئے کہا " کچھ بھی تو نہیں ہے" کیسی ہانڈی ؟"

بھوندو زور لگا کر کھٹولی سے اٹھا ۔ آنچل کے نیچے چھپی ہوئی ہانڈی کھول اور

اس کے اندر نظر ڈال کر بولا۔ "ابھی لوٹا، نہیں تو ہانڈی پھوڑ دوں گا۔"

بنٹی نے دھوتی نچوڑتے ہوئے کہا "ذرا آئینہ میں صورت دیکھو، گھی، دودھ کچھ نہ ملے گا تو کیسے اٹھو گے یا ہمیشہ چارپائی پر پڑے رہنے کا ارادہ ہے؟"

بھوندو نے کھٹولی پر لیٹے ہوئے کہا۔ "اپنے لیے ایک ساڑھی بھی نہیں لائی۔ میرے لیے گھی اور دودھ سب چاہیئے۔ میں گھی نہ کھاؤں گا۔"

بنٹی نے مسکرا کر کہا "اسی لیے تو گھی کھلاتی ہوں کہ تم جلدی سے کام دھندا کرنے لگو۔ اور میرے لیے ساڑھی لاؤ"

بھوندو بولا "تو آج کہیں چوری کرنے جاؤں کیوں؟"

بنٹی نے بھوندو کے گال پر آہستہ سے چپت لگا کر کہا "پہلے میرا اگلا کاٹ دینا پھر۔"

شکوہ شکایت

زندگی کا بڑا حصّہ تو اِسی گھر میں گزر گیا، مگر کبھی آرام نہ نصیب ہوا۔ میرے شوہر دنیا کی نگاہ میں بڑے نیک اور خوش خلق اور فیاض اور بیدار مغز ہوں گے، لیکن جس پر گزرتی ہے، وہی جانتا ہے۔ دنیا کو تو ان لوگوں کی تعریف میں مزہ آتا ہے، جو اپنے گھر کو جہنم میں ڈال رہے ہوں اور غیروں کے پیچھے اپنے آپ کو تباہ کئے ڈالتے ہوں۔ جو گھر والوں کے لیے مرتا ہے، اس کی تعریف دنیا والے نہیں کرتے۔ وہ تو ان کی نگاہ میں خود غرض ہے، بخیل ہے تنگ دل ہے مغرور ہے، کور باطن ہے۔ اسی طرح جو لوگ باہر والوں کے لیے مرتے ہیں ان کی تعریف گھر والے کیوں کرنے لگے۔ اب انھیں کو دیکھو صبح سے شام تک مجھے پریشان کیا کرتے ہیں، باہر سے کوئی چیز منگواؤ تو ایسی دوکان سے لائیں گے، جہاں کوئی گاہک بھول کر بھی نہ جاتا ہو۔ ایسی دوکانوں پر نہ چیز اچھی ملتی ہے۔ نہ وزن ٹھیک ہوتا ہے، نہ دام ہی مناسب۔ یہ

نقائص نہ ہوتے تو وہ دوکان بدنام ہی کیوں ہوتی ، انھیں ایسی ہی دوکان سے سودا سلف خریدنے کا مرض ہے ۔ بارہا کہا کسی چلتی ہوئی دوکان سے چیزیں لایا کرو ۔ وہاں مال زیادہ کھپتا ہے ۔ اس لیے تازہ مال آتا رہتا ہے ۔ مگر نہیں ٹٹپونجیوں سے ان کی ہمدردی ہے ۔ اور وہ انھیں الٹے استرے سے مونڈتے ہیں گیہوں لائیں گے تو سارے بازار سے خراب ، گھنا ہوا چاول ایسا موٹا کہ بیل بھی نہ پوچھے دال میں کنکر بھرے ہوئے ، منوں لکڑی جلا ڈالو ۔ کیا مجال کہ گلے گھی لائیں گے تو آدھوں آدھ تیل اور نرخ اصلی گھی سے ایک چھٹانک کم ۔ تیل لائیں گے تو ملاوٹ کا بالوں میں ڈالو تو چپک جائیں مگر دام دے آئیں گے اعلیٰ درجے کے چنبیلی کے تیل کے چلتی ہوئی دوکان پر جاتے تو جیسے انہیں ڈر لگتا ہے ، شاید اونچی دوکان اور پھیکے پکوان کے قائل ہیں ۔ میرا تجربہ کہتا ہے کہ نیچی دوکان پر سڑے پکوان ہی ملتے ہیں ۔

ایک دن کی بات ہو تو برداشت کر لی جائے روز روز کی یہ مصیبت نہیں برداشت ہوتی ۔ میں کہتی ہوں آخر ٹٹپونجیوں کی دوکان پر جاتے ہی کیوں ہیں کیا ان کی پرورش کا ٹھیکہ تمہیں نے لے لیا ہے آپ فرماتے ہیں ، مجھے دیکھ کر بلانے لگتے ہیں ، خوب ذرا انھیں بلا لیا اور خوشامد کے دو چار الفاظ سنا دیئے بس آپ کا مزاج آسمان پر جا پہنچا پھر انھیں سدھ نہیں رہتی کہ وہ کوڑا کرکٹ باندھ رہا ہی یا کیا ۔ پوچھتی ہوں تم اس راستے سے جاتے ہے کیوں ہو ؟ کیوں کسی دوسرے راستے سے نہیں جاتے ؟ ایسے اُٹھائی گیروں کو منہ ہی کیوں لگاتے ہو ؟ اس کا کوئی جواب نہیں ۔ ایک خموشی سو بلاؤں کو ٹالتی ہے ۔

ایک بار ایک زیور بنوانا تھا ۔ میں تو حضرت کو جانتی تھی ۔ ان سے پوچھنے

کی ضرورت نہ سمجھی ۔ ایک پہچان کے سنار کو بلا رہی تھی، اتفاق سے آپ بھی موجود تھے ۔ بولے یہ فرقہ بالکل اعتبار کے قابل نہیں ۔ دھوکا کھاؤ گی ۔ میں ایک سنار کو جانتا ہوں، میرے ساتھ کا پڑھا ہوا ہے، برسوں ساتھ ساتھ کھیلے ہیں ۔ میرے ساتھ چالبازی نہیں کر سکتا ۔ میں نے سمجھا جب ان کا دوست ہے اور وہ بھی بچپن کا، تو کہاں تک دوستی کا حق نہ نبھائے گا ۔ سونے کا ایک زیور اور پچاس روپے ان کے حوالے کئے اور اس بھلے آدمی نے وہ چیز اور روپے نہ جانے کس بے ایمان کو دے دیئے کہ برسوں پیہم تقاضوں کے بعد جب چیز بن کر آئی تو روپے میں آٹھ آنے تانبا اور اتنی بدنما کہ دیکھ کر گھن آتی تھی ۔ برسوں کا ارمان خاک میں مل گیا ۔ روپیٹ کر بیٹھ رہی ۔ ایسے ایسے وفادار تو ان کے دوست ہیں جنہیں دوست کی گردن پر چھری پھیرنے میں عار نہیں ۔ ان کی دوستی بھی انھیں لوگوں سے ہے جو زمانے بھر کے فاقہ مست، قلاش بے سروسامان ہیں جن کا پیشہ ہی ان جیسے آنکھ کے اندھوں سے دوستی کرنا ہے ۔ روز ایک نہ ایک صاحب مانگنے کے لیے سوار رہتے ہیں اور بلا لئے گلا نہیں چھوڑتے، مگر ایسا کبھی نہ ہوا کہ کسی نے روپے ادا کئے ہیں ۔ آدمی ایک بار کھو کر سیکھتا ہے دوبارہ کھو کر سیکھتا ہے، مگر یہ بھلے مانس ہزار بار کھو کر بھی سیکھتے، جب کہتی ہوں روپے دے آئے اب مانگ کیوں نہیں لاتے ۔ کیا مر گئے تمھارے وہ دوست تو بس بغلیں جھانک کر رہ جاتے ہیں، آپ سے دوستوں کو سوکھا جواب نہیں دیا جاتا ۔ خیر سوکھا جواب نہ دو، میں بھی نہیں کہتی کہ دوستوں سے بے مروتی کرو ۔ مگر ٹال تو سکتے ہو ۔ کیا بہانے نہیں بنا سکتے ہو ۔ مگر آپ انکار نہیں کر سکتے ۔ کسی دوست نے کچھ طلب کیا اور آپ کے سر پر بوجھ پڑا ۔ بیچارے

کیسے انکار کریں۔ آخر لوگ جان دے جائیں گے کہ یہ حضرت بھی فاقہ سے ہیں دنیا انہیں امیر سمجھتی رہے چاہے میرے زیور ہی کیوں نہ گرو رکھنے پڑیں۔ سچ کہتی ہوں بعض اوقات ایک ایک پیسہ کی تنگی ہو جاتی ہے اور اس بھلے آدمی کو روپے جیسے گھر میں کاٹتے ہیں۔ جب تک روپیوں کے وارے نیارے نہ کرے اسے کسی پہلو قرار نہیں۔ ان کے کرتوت کہاں تک کہوں، میری تو ناک میں دم آگیا۔ ایک نہ ایک مہمان روز کی طرح سر پر سوار نہ جانے کہاں کے بے فکرے۔ ان کے دوست ہیں کوئی کہیں سے آکر مرتا ہے۔ کوئی کہیں سے۔ گھر کیا ہے اپاہجوں کا اڈا ہے، ذرا سا تو گھر مشکل سے دو چار پائیاں، اوڑھنا بچھونا بھی با افراط نہیں مگر آپ ہیں کہ دوستوں کو دعوت دینے کے لیے تیار۔ آپ تو مہمان کے ساتھ لیٹیں گے اس لیے انھیں چار پائی بھی چاہیے۔ اوڑھنا بچھونا بھی چاہیے ورنہ گھر کا پردہ کھل جائے۔ جاتی ہے تو میرے اور بچوں کے سر زمین پر سکڑ کر رات کاٹتے ہیں۔ گرمیوں میں تو خیر مضائقہ نہیں لیکن جاڑوں میں تو بس قیامت ہی آجاتی ہے گرمیوں میں بھی کھلی چھت پر تو مہمانوں کا قبضہ ہو جاتا ہے۔ اب میں بچوں کو لیے قفس میں پڑی تڑپا کروں اتنی سمجھ بھی نہیں کہ جب گھر کی یہ حالت ہے تو کیوں ایسوں کو مہمان بنائیں جن کے پاس کپڑے لتے تک نہیں۔ خدا کے فضل سے ان کے بھی دوست ایسے ہی ہیں ایک بھی خدا کا بندہ ایسا نہیں جو ضرورت کے وقت انھیں دھیلے سے بھی مدد کرے۔ دو ایک بار حضرت کو اس کا تجربہ اور بے حد تلخ تجربہ ہو چکا ہے۔ مگر اس مرد خدا نے تو آنکھیں کھولنے کی قسم کھالی ہے۔ ایسے ہی ناداروں سے ان کی پٹتی ہے۔ ایسے ایسے لوگوں سے آپ کی دوستی ہے کہ کہتے شرم آتی ہے، جسے

کوئی اپنے دروازے پر کھڑا بھی نہ ہونے دے وہ آپ کا دوست ہے، شہر میں اتنے امیر کبیر ہیں آپ کا کسی سے بھی ربط ضبط نہیں کسی کے پاس نہیں جاتے امرا مغرور ہیں، مدمغ ہیں، خوشامد پسند ہیں اُن کے پاس کیسے جائیں۔ دوستی گانٹھیں گے تو ایسوں سے جن کے گھر ہیں کھانے کو بھی نہیں۔

ایک بار ہمارا خدمت گار چلا گیا اور کئی دن دوسرا خدمت گار نہ ملا میں کسی ہوشیار اور سلیقہ مند نوکر کی تلاش میں تھی مگر بابو صاحب کو جلد سے جلد کوئی آدمی رکھ لینے کی فکر سوار ہوئی۔ گھر کے سارے کام بدستور چل رہے تھے۔ مگر آپ کو معلوم ہو رہا تھا کہ گاڑی رکی ہوئی ہے۔ ایک دن جانے کہاں سے ایک بانگڑو پکڑ لائے۔ اس کی صورت کہے دیتی تھی کہ کوئی جانگلو ہے، مگر آپ نے اس کی ایسی ایسی تعریفیں کیں کہ کیا کہوں۔ بڑا فرماں دار ہے۔ پرلے سرے کا ایمان دار، بلا کا محنتی، غضب کا سلیقہ شعار اور انتہا درجہ کا باتمیز خیر میں نے رکھ لیا میں بار بار کیوں کر ان کی باتوں میں آجاتی ہوں مجھے خود تعجب ہے۔ یہ آدمی صرف شکل سے آدمی تھا۔ آدمیت کی کوئی علامت اس میں نہ تھی۔ کسی کام کی تمیز نہیں بے ایمان نہ تھا۔ مگر احمق اول نمبر کا، بے ایمان ہوتا تو کم سے کم اتنی تسکین تو ہوتی کہ خود کھاتا ہے کمبخت دوکان داروں کی فطرتوں کا شکار ہو جاتا تھا اسے دس تک گنتی بھی نہ آتی تھی۔ ایک روپیہ دے کر بازار بھیجوں تو شام تک حساب نہ سمجھا سکے غصہ پی پی کر رہ جاتی تھی۔ خون جوش کھانے لگتا تھا کہ سور کے کان اکھاڑ لوں۔ مگر ان حضرت کو کبھی اسے کچھ کہتے نہیں دیکھا آپ نہا کر دھوتی چھانٹ رہے ہیں اور وہ دور بیٹھا تماشا دیکھ رہا ہے میرا

خون کھولنے لگتا۔ لیکن انہیں ذرا بھی احساس نہیں ہوتا جب میرے ڈانٹنے پر دھوتی چھانٹنے جاتا بھی تو آپ اسے قریب نہ آنے دیتے۔ اس کے عیبوں کو ہُنر بنا کر دکھایا کرتے تھے اور اس کوشش میں کامیاب نہ ہوتے۔ تو ان عیوب پر پردہ ڈال دیتے تھے۔ کمبخت کو جھاڑو دینے کی بھی تمیز نہ تھی۔ مردانہ کمرے ہی تو سارے گھر میں ڈھنگ کا ایک کمرہ ہے۔ اس میں جھاڑو دیتا تو ادھر کی چیز اُدھر، اُوپر کی نیچے گویا سارے کمرے میں زلزلہ آگیا ہو اور گرد کا یہ عالم کہ سانس لینی مشکل مگر آپ کمرے میں اطمینان سے بیٹھے رہتے گویا کوئی بات ہی نہیں۔ ایک دن میں نے اسے خوب ڈانٹا اور کہہ دیا اگر کل سے تو نے سلیقہ سے جھاڑو نہ دی تو کھڑے کھڑے نکال دوں گی۔ سویرے سو کر اٹھی تو دیکھتی ہوں کمرے میں جھاڑو دی ہوئی ہے۔ ہر ایک چیز قرینے سے رکھی ہے۔ گرد و غبار کا کہیں کا نام نہیں آپ نے فوراً ہنس کر کہا" دیکھتی کیا ہو۔ آج گھورے نے بڑے سویرے جھاڑو دی ہے میں نے سمجھا دیا، تم طریقہ تو بتاتی نہیں ہو الٹی ڈانٹنے لگتی ہو۔" لیجیے صاحب یہ میری ہی خطا تھی۔ خیر میں نے سمجھا اس نالائق نے کم سے کم ایک کام تو سلیقے کے ساتھ کیا، اب روز کمرہ صاف ملتا اور میری نگاہوں میں گھورے کی کچھ وقعت ہونے لگی، اتفاق کی بات ایک دن میں ذرا معمول سے سویرے اُٹھ بیٹھی اور کمرے میں آئی تو کیا دیکھتی ہوں کہ گھورے دروازے پر کھڑا ہے اور خود بدولت بڑی تندہی سے جھاڑو دے رہے ہیں مجھ سے ضبط نہ ہو سکا ان کے ہاتھ سے جھاڑو چھین لی اور گھورے کے سر پر ٹیک دی۔ حرام خور کو اسی وقت دھتکار بتائی۔ آپ فرمانے لگے اس کی تنخواہ تو بیباق کر دو۔ خوب ایک تو کام نہ کرے دوسرے آنکھیں دکھائے اس پر

تنخواہ بھی دے دوں ۔ میں نے ایک کوڑی بھی نہ دی ۔ ایک کرتا دیا تھا ۔ وہ بھی چھین لیا ، اس پر حضرت کتنی دن مجھ سے روٹھے رہے ، گھر چھوڑ کر بھاگے جا رہے تھے بڑی مشکلوں سے رُکے ۔

ایک دن مہتر نے اتارے کپڑوں کا سوال کیا اس بیکاری کے زمانہ میں فالتو کپڑے کس کے گھر میں ہیں ، شاید رئیسوں کے گھر میں ہوں ۔ میرے یہاں تو ضروری کپڑے بھی کافی نہیں ۔ حضرت ہی کا توشہ خانہ ایک بقچی میں آجائے گا ۔ جو ڈاک کے پارسل سے کہیں بھیجا جا سکتا ہے ، پھر اس سال سردی کے موسم میں نئے کپڑے بنوانے کی نوبت بھی نہ آتی تھی ۔ میں نے مہتر کو صاف جواب دے دیا ۔ سردی شدت کی تھی ۔ اس کا مجھے خود احساس تھا ، غریبوں پر کیا گزرتی ہے ۔ اس کا بھی علم تھا ۔ لیکن میرے یا آپ کے پاس اس کا افسوس کے سوا اور کیا علاج ہے جب رُوسا اور امرا کے پاس ایک ایک مال گاڑی کپڑوں سے بھری ہوئی ہے تو پھر غربا کیوں نہ برہنگی کا عذاب جھیلیں ۔ خیر میں نے تو اُسے جواب دے دیا ۔ آپ نے کیا کیا اپنا کوٹ اتار کر اُس کے حوالے کر دیا ۔ میری آنکھوں میں خون اتر آیا ۔ حضرت کے پاس یہی کوٹ تھا یہ خیال نہ ہوا کہ پہنیں گے کیا ، مہتر نے سلام کیا ، دعائیں دیں اور اپنی راہ لی ، آخر کئی دن سردی کھاتے رہے صبح کو گھومنے جایا کرتے تھے ، وہ سلسلہ بند گیا مگر دل بھی قدرت نے انھیں عجیب قسم کا دیا ہے ۔ پھٹے پُرانے کپڑے پہنتے آپ کو شرم نہیں آتی ، میں تو کٹ جاتی ہوں ۔ آپ کو مطلق احساس نہیں ۔ کوئی ہنستا ہے تو ہنسے آپ کی بلا سے آخر مجھ سے نہ دیکھا گیا تو ایک کوٹ بنوا دیا ۔ جی تو جلتا تھا کہ خوب سردی کھانے دوں مگر ڈری کہ کہیں بیمار پڑ

جائیں تو اور بھی آفت آجائے۔ آخر کام تو انھیں کو کرنا ہے۔

یہ اپنے دل میں سمجھتے ہوں گے میں کتنا نیک نفس اور منکسر مزاج ہوں، شاید ان اوصاف پر ناز ہو، میں انھیں نیک نفس نہیں سمجھتی ہوں، یہ سادہ لوحی ہے سیدھی سادی حماقت جس مہتر کو آپ نے اپنا گوٹ دیا اسی کو میں نے کئی بار رات شراب کے نشے میں بدمست جھومتے دیکھا ہے اور آپ کو دکھا بھی دیا ہے، تو پھر دوسروں کی کج ردی کا تاوان ہم کیوں دیں۔ اگر آپ نیک نفس اور فیاض ہوتے تو گھر والوں کو اس کا عشر عشیر بھی نہ ملنا چاہیے۔ اتنی عمر گزر گئی مگر اس شخص نے کبھی اپنے دل سے میرے لیے ایک سوغات بھی نہ خریدی۔ بے شک جو چیز طلب کروں اسے بازار سے لانے میں انھیں کلام نہیں مطلق عذر نہیں مگر روپیہ بھی دے دوں شرط یہ ہے۔ انھیں خود کبھی توفیق نہیں ہوتی۔ یہ میں مانتی ہوں کہ بیچارے اپنے لیے بھی کچھ نہیں لاتے میں جو کچھ منگوا دوں اس پر قناعت کر لیتے ہیں، مگر آخر انسان کبھی کبھی شوق کی چیزیں چاہتا ہی ہے۔ اور مردوں کو دیکھتی ہوں گھر میں عورت کے لیے طرح طرح کے زیور کپڑے شوق سنگار کے لوازمات لاتے رہتے ہیں۔ یہاں یہ رسم ممنوع ہے۔ بچوں کے لیے بھی مٹھائی کھلونے، باجے، بگل، شاید اپنی زندگی میں ایک بار بھی نہ لائے ہوں قسم سی کھالی ہے۔ اس لیے میں تو انھیں بخیل کہوں گی، مردہ دل کہوں گی، فیاض نہیں کہہ سکتی۔ دوسروں کے ساتھ ان کا جو فیاضانہ سلوک ہے اسے میں حرص نمود اور سادہ لوحی پر محمول کرتی ہوں آپ کی منکسر مزاجی کا یہ حال ہے کہ جس دفتر میں آپ ملازم ہیں اُس کے کسی عہدہ دار سے آپ کا میل جول نہیں۔ افسروں کو سلام کرنا تو آپ کے آئین کے

خلاف ہے۔ نذر یا ڈالی تو دور کی بات ہے اور تو اور کبھی کسی افسر کے گھر جاتے ہی نہیں اس کا خمیازہ آپ نہ اٹھائیں تو کون اٹھائے اوروں کو رعائتی چھٹیاں ملتی ہیں۔ آپ کی تنخواہ کٹتی ہے۔ اوروں کی ترقیاں ہوتی ہیں آپ کو کوئی پوچھتا بھی نہیں، حاضری میں پانچ منٹ بھی دیر ہو جائے تو جواب طلب ہو جاتا ہے۔ بیچارے جی توڑ کر کام کرتے ہیں۔ کوئی پیچیدہ مشکل کام آجائے تو انھیں کے سر منڈھا جاتا ہے۔ انھیں مطلق عذر نہیں دفتر میں انھیں گھسو اور پسّو وغیرہ خطابات ملے ہوئے ہیں۔ مگر منزل کتنی ہی دشوار طے کریں ان کی تقدیر میں وہی سوکھی گھاس لکھی ہے۔ یہ انکسار نہیں ہے میں تو اُسے زمانہ شناسی کا فقدان کہتی ہوں۔ آخر کیوں کوئی شخص آپ سے خوش ہو دنیا میں مروت اور رواداری سے کام چلتا ہے اگر ہم کسی سے کھنچے رہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ وہ ہم سے نہ کھنچا رہے۔ پھر جب دل میں کبیدگی ہوتی ہے تو وہ دفتری تعلقات میں بھی ظاہر ہو جاتی ہے۔ جو ماتحت افسر کو خوش رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ جس کی ذات سے افسر کو کوئی ذاتی فائدہ پہنچتا ہے جس پر اعتبار ہوتا ہے اس کا لحاظ وہ لازمی طور پر کرتا ہے ایسے بے غرضوں سے کیوں کسی کو ہمدردی ہونے لگی۔ افسر بھی انسان ہیں اُن کے دل میں جو اعزاز و امتیاز کی ہوس ہے وہ کہاں پوری ہو جب اس کے ماتحت ہی فرنٹ رہیں آپ نے جہاں ملازمت کی وہیں سے نکالے گئے۔ کبھی کسی دفتر میں سال دو سال سے زیادہ نہ چلے یا تو افسروں سے لڑ گئے یا کام کی کثرت کی شکایت کر بیٹھے۔

آپ کو کنبہ پروری کا دعویٰ ہے آپ کے کئی بھائی بھتیجے ہیں، وہ کبھی آپ

کی بات بھی نہیں پوچھتے۔ مگر آپ برابر ان کا منہ تاکتے رہتے ہیں، ان کے ایک بھائی صاحب آج کل تحصیل دار ہیں۔ گھر کی جائیداد انھیں کی نگرانی میں ہے وہ شان سے رہتے ہیں۔ موٹر خرید لی ہے کئی نوکر ہیں۔ مگر یہاں بھولے سے بھی خط نہیں لکھتے۔ ایک بار ہمیں روپے کی سخت ضرورت ہوئی میں نے کہا برادر مکرم سے کیوں نہیں مانگتے کہنے لگے کیوں انھیں پریشان کروں۔ آخر انھیں بھی تو اپنا خرچ کرنا ہے کون سی ایسی بچت ہو جاتی ہو گی میں نے بہت مجبور کیا تو آپ نے خط لکھا معلوم نہیں خط میں کیا لکھا لیکن روپے نہ آنے تھے نہ آئے کئی دنوں کے بعد میں نے پوچھا کچھ جواب آیا حضور کے بھائی صاحب کے دربار سے؟ آپ نے ترش ہو کر کہا ابھی ایک ہفتہ تو خط پہنچے ہوئے ہوا ابھی کیا جواب آسکتا ہے، ایک ہفتہ اور گزر گیا اب آپ کا یہ حال ہے کہ مجھے کوئی بات کرنے کا موقع ہی نہیں عطا فرماتے۔ اتنے بشاش نظر آتے ہیں کہ کیا کہوں باہر سے آتے ہیں تو خوش خوش کوئی نہ کوئی شگوفہ لیے ہوئے، میری خوشامد بھی خوب ہو رہی ہے۔ میرے میکے والوں کی تعریف بھی ہو رہی ہے، میں حضرت کی چال سمجھ رہی تھی یہ ساری دلجوئیاں محض اس لیے تھیں کہ آپ کے برادر مکرم کے متعلق کچھ پوچھ نہ بیٹھوں۔ سارے ملکی، مالی، اخلاقی ترقی مسائل میرے سامنے بیان کیے جاتے تھے۔ اتنی تفصیل اور شرح کے ساتھ کہ پروفیسر بھی دنگ رہ جائے محض اس لیے کہ مجھے اس امر کی بابت کچھ پوچھنے کا موقع نہ ملے لیکن میں کب چوکنے والی تھی۔ جب پورے دو ہفتے گزر گئے اور بیمہ کمپنی کے روپے روانہ کرنے کی تاریخ موت کی طرح سر پر آپہنچی تو میں نے پوچھا کیا ہوا حصہ بھی گھر کی جائیداد میں کچھ ہے

یا نہیں ؟ یا ہم کسی لونڈی باندی کی اولاد ہیں ؟ پانچسو روپے سال کا نفع تو دس سال قبل تھا ، اب ایک ہزار سے کم نہ ہو گا ، کبھی ایک جھنجھی کوڑی بھی ہمیں نہیں ملی موٹے حساب سے ہمیں دو ہزار ملنا چاہیے دو ہزار نہ ہو ایک ہزار ہو پانچ سو ہو ، ڈھائی سو ہو کچھ نہ ہو تو ہمیہ کمپنی کے پرمیم بھر کو تو ہو ۔ تحصیلدار کی آمدنی ہماری آمدنی کی چوگنی ہے ۔ رشوتیں بھی لیتے ہیں ، تو پھر ہمارے روپے کیوں نہیں دیتے آپ ہیں ہیں ہاں ہاں کرنے لگے بچارے گھر کی مرمت کراتے ہیں ، عزیز و اقارب کی مہمانداری کا بار بھی تو انھیں پر ہے خوب ! گویا جائیداد کا منشا محض یہ ہے کہ اُس کی کمائی اسی میں صرف ہو جائے ۔ اس بھلے آدمی کو بہلانے پھسلانے نہیں آتے مجھ سے پوچھتے ایک نہیں ہزار بتا دیتی کہہ دیتے گھر میں آگ لگ گئی سارا اثاثہ جل کر خاک ہو گیا یا چوری ہو گئی ، چور نے گھر میں تنکا تک نہ چھوڑا ۔ یا دس ہزار غلہ خریدا تھا اس میں خسارہ ہو گیا گھاٹے بیچنا پڑا ۔ یا کسی سے مقدمہ بازی ہو گئی اس میں دیوالہ پٹ گیا ۔ آپ کو سوجھی بھی تو پھیکی سی بات اس جولائی طبع پر آپ مصنف اور شاعر بھی بنتے ہیں ۔ تقدیر ٹھونک کر بیٹھ رہی ، پڑوس کی بھی آپ بھائی بھتیجوں کی تعریف کے پل باندھتے ہیں تو میرے جسم میں آگ لگ جاتی ہے ۔ ایسے برادرانِ یوسف سے خدا بچائے ۔

خدا کے فضل سے آپ کے دو بچے ہیں ، دو بچیاں بھی ہیں ۔ خدا کا فضل کہوں یا خدا کا قہر کہوں سب کے سب اتنے شریر ہو گئے ہیں کہ معاذ اللہ مگر کیا مجال کہ یہ بھلے مانس کسی بچے کو تیز نگاہ سے بھی دیکھیں رات کے آٹھ بج گئے ہیں ۔ بڑے صاحب زادے ابھی گھوم کر نہیں آئے میں گھبرا رہی ہوں ۔ آپ اطمینان سے

بیٹھے اخبار پڑھ رہے ہیں جھلائی ہوئی آتی ہوں اور اخبار چھین کر کہتی ہوں جا کر دیکھتے کیوں نہیں لونڈا کہاں رہ گیا۔ نہ جانے تمہارے دل میں کچھ قلق ہے بھی یا نہیں۔ تمہیں تو خدا نے اولاد ہی ناحق دی آج آتے تو خوب ڈانٹنا" تب آپ بھی گرم ہو جاتے ہیں ابھی تک نہیں آیا بڑا شیطان ہے! بچا آتے ہیں تو کان اکھاڑ لیتا ہوں۔ مارے تھپڑوں کے کھال ادھیڑ کر رکھ دوں گا، یوں بگڑ کر طیش کے عالم میں آپ اس کی تلاش کرنے نکلتے ہیں، اتفاق سے آپ ادھر جاتے ہیں، ادھر لڑکا آجاتا ہے۔ میں کہتی ہوں تو کدھر سے آگیا۔ وہ بچارے تجھے ڈھونڈنے گئے ہوتے ہیں۔ دیکھنا آج کیسی مرمت ہوتی ہے۔ یہ عادت ہی چھوٹ جائے گی۔ دانت پیس رہے تھے۔ آتے ہی ہوں گے چھڑی بھی ہاتھ میں ہے۔ تم اتنے شریر ہو گئے ہو کہ بات نہیں سنتے، آج قدر و عافیت معلوم ہو گی۔ لڑکا سہم جاتا ہے اور لیمپ جلا کر پڑھنے لگتا ہے۔ آپ ڈیڑھ دو گھنٹے میں لوٹتے ہیں، حیران و پریشان اور بدحواس، گھر میں قدم رکھتے ہی پوچھتے ہیں آیا کہ نہیں؟

میں ان کا غصہ بھڑکانے کے ارادے سے کہتی ہوں، آکر بیٹھا تو ہے جا کر پوچھتے کیوں نہیں؟ پوچھ کر ہار گئی کہاں گیا تھا۔ کچھ بولتا ہی نہیں"۔

آپ گرج پڑتے ہیں۔ "منو یہاں آؤ"۔

لڑکا تھر تھر کانپتا ہوا آکر آنگن میں کھڑا ہو جاتا ہے، دونوں بچیاں گھر میں چھپ جاتی ہیں کہ خدا جانے کیا آفت نازل ہونے والی ہے، چھوٹا بچہ کھڑکی سے چوہے کی طرح جھانک رہا ہے، آپ جامہ سے باہر ہیں، ہاتھ میں چھڑی ہے۔ میں بھی وہ غضب ناک چہرہ دیکھ کر پچھتانے لگتی ہوں کہ کیوں ان سے شکایت کی۔ آپ

لڑکے کے پاس جاتے ہیں۔ مگر بناوٹی غصہ سے کہتے ہیں: "تم کہاں گئے تھے جی منع کیا جاتا ہے مانتے نہیں ہو۔ خبردار اب جو اتنی دیر کی۔ آدمی شام کو گھر چلا آتا ہے۔ یا ادھر اُدھر گھومتا ہے؟"

میں سمجھ رہی ہوں یہ تمہید ہے۔ قصیدہ اب شروع ہوگا۔ گریز تو بُری نہیں لیکن یہاں تمہید ہی خاتمہ ہو جاتی ہے، بس آپ کا غصہ فرد ہو گیا۔ لڑکا اپنے کمرے میں چلا جاتا ہے، اور غالباً خوشی سے اُچھلنے لگتا ہے۔

میں احتجاج کی صدا بلند کرتی ہوں۔ "تم تو جیسے ڈر گئے۔ بھلا دو چار طمانچے تو لگائے ہوتے۔ اس طرح تو لڑکے شیر ہو جاتے ہیں، آج آٹھ بجے آیا ہے، کل نو کی خبر لائے گا۔ اس نے بھی دل میں کیا سمجھا ہوگا۔"

آپ فرماتے ہیں "تم نے سنا نہیں میں نے کتنی زور سے ڈانٹا بچے کی روح ہی فنا ہو گئی ہوگی۔ دیکھ لینا جو پھر کبھی دیر میں آئے گا"

"تم نے ڈانٹا تو نہیں ہاں آنسو پونچھ دیئے۔"

آپ نے نئی اُپج نکالی ہے کہ لڑکے تادیب سے خراب ہو جاتے ہیں آپ کے خیال میں لڑکوں کو آزاد رہنا چاہیے۔ ان پر کسی قسم کی بندش یا دباؤ نہ ہونا چاہیے۔ بندش سے آپ کے خیال میں لڑکے کی دماغی نشوونما میں رکاوٹ پیدا ہو جاتی ہے۔ اسی کا یہ نتیجہ ہے کہ لڑکے شتر بے مہار بنے ہوئے ہیں۔ کوئی ایک منٹ بھی کتاب کھول کر نہیں بیٹھتا۔ کبھی گلی ڈنڈا ہے کبھی گولیاں کبھی کنکوے۔ حضرت بھی انھیں کے ساتھ کھیلتے ہیں۔

چالیس سال سے متجاوز آپ کی عمر ہے۔ مگر لڑکپن دل سے نہیں گیا۔ میرے

باپ کے سامنے مجال تھی کہ کوئی لڑکا کنکوا اڑائے یا گلی ڈنڈا کھیل سکے۔ خون پی جاتے صبح سے لڑکوں کو پڑھانے بیٹھ جاتے۔ اسکول سے جوں ہی لڑکے واپس آتے پھر لے بیٹھتے۔ بس شام کو آدھ گھنٹے کی چھٹی دیتے۔ رات کو پھر کام میں جوت دیتے یہ نہیں کہ آپ تو اخبار پڑھیں اور لڑکے گلی گلی کی خاک چھانتے پھریں کبھی آپ بھی سینگ کٹا کر بچھڑے بن جاتے ہیں، لڑکوں کے ساتھ تاش کھیلنے بیٹھ جاتے ہیں۔ ایسے باپ کا لڑکوں پر کیا رعب ہو سکتا ہے، اباجان کے سامنے میرے بھائی سیدھے آنکھ اٹھا کر دیکھ نہیں سکتے تھے۔ ان کی آواز سنتے ہی قیامت آجاتی تھی انھوں نے گھر میں قدم رکھا اور خاموشی طاری ہوئی، ان کے روبرو جاتے ہوئے لڑکوں کی جان نکلتی تھی۔ اور اسی تعلیم کی یہ برکت ہے کہ سبھی اچھے عہدوں پر پہنچ گئے صحت البتہ کسی کی بہت اچھی نہیں ہے۔ تو اباجان کی صحت ہی کون بہت اچھی تھی، بچارے ہمیشہ کسی نہ کسی بیماری میں مبتلا رہتے، پھر لڑکوں کی صحت کہاں سے اچھی ہو جاتی، لیکن کچھ بھی ہو تعلیم و تادیب میں انھوں نے کسی کے ساتھ رعائت نہیں کی۔

ایک روز میں نے حضرت کو بڑے صاحبزادے کو کنکوا کی تعلیم دیتے دیکھا' یوں گھماؤ یوں غوطہ دو، یوں کھینچو، یوں ڈھیل دو۔ ایسا دل و جان سے سکھا رہے تھے، گویا گرو فتر دے رہے ہوں۔ اس دن میں نے بھی ان کی ایسی خبر لی کہ یاد کرتے ہوں گے، میں نے صاف کہہ دیا تم کون ہوتے ہو میرے بچوں کو بگاڑنے والے تمہیں گھر سے کوئی مطلب نہیں ہے نہ ہو لیکن آپ میرے بچوں کو خراب مت کیجئے۔ بُرے بُرے شوق نہ پیدا کیجیے۔ اگر آپ انھیں سدھار نہیں سکتے

تو کم سے کم بگاڑیئے مت لگے باتیں بنانے ابا جان کسی لڑکے کو میلے تماشے نہ لے جاتے تھے۔ لڑکا سر پٹک کر مر جائے مگر ذرا بھی نہ پسیجے تھے۔ اور ان بھلے آدمی کا یہ حال ہے کہ ایک ایک سے پوچھ کر میلے لے جاتے ہیں۔ چلو چلو وہاں بڑی بہار ہے۔ خوب آتش بازیاں چھوٹیں گی۔ غبارے اُڑیں گے، ولایتی چرخیاں بھی ہیں، ان پر مزے سے بیٹھنا اور تو اور آپ لڑکوں کو ہاکی کھیلنے سے بھی نہیں روکتے، یہ انگریزی کھیل بھی کتنے خوفناک ہوتے ہیں، کرکٹ، فٹ بال، ہاکی، ایک سے ایک مہلک، گیند لگ جائے تو جان ہی لے کر چھوڑے مگر آپ کو ان کھیلوں سے بڑی رغبت ہے کوئی لڑکا میچ میں جیت کر آجاتا ہے، تو کتنے خوش ہوتے ہیں گویا کوئی قلعہ فتح کر آیا ہو۔ حضرت کو ذرا بھی اندیشہ نہیں ہے کہ کسی لڑکے کے چوٹ لگ گئی، تو کیا ہوگا، ہاتھ پاؤں ٹوٹ گیا تو بچاروں کی زندگی کیسے پار لگے گی۔

پچھلے سال لڑکی کی شادی تھی، آپ کو یہ ضد تھی کہ جہیز کے نام کانی کوڑی بھی نہ دیں گے چاہے لڑکی ساری عمر کنواری بیٹھی رہے۔ آپ اہل دنیا کی خبیث النفسی آئے دن دیکھتے رہتے ہیں پھر بھی چشم بصیرت نہیں کھلتی جب تک سماج کا یہ نظام قائم ہے اور لڑکی کا بلوغ کے بعد کنواری رہنا انگشت نمائی کا باعث ہے اس وقت تک یہ رسم فنا نہیں ہو سکتی دو چار افراد بھلے ہی ایسے بیدار مغز نکل آئیں جو جہیز لینے سے انکار کریں لیکن اس کا اثر عام حالات پر بہت کم پڑتا ہے۔ اور برائی بدستور قائم رہتی ہے جب لڑکوں کی طرح لڑکیوں کے لیے بھی بیس پچیس کی عمر تک کنواری رہنا بدنامی کا باعث نہ سمجھا جائے گا۔ اس وقت

آپ ہی آپ یہ رسم رخصت ہو جائے گی۔ میں نے جہاں جہاں پیغام دیئے۔ جہیز کا مسئلہ پیدا ہوا اور آپ نے ہر موقع پر ٹانگ اڑا دی، جب اس طرح ایک پورا سال گزر گیا۔ اور لڑکی کا سترھواں سال شروع ہو گیا تو میں نے ایک جگہ بات پکی کر لی، حضرت بھی راضی ہو گئے کیونکہ ان لوگوں نے قرار داد نہیں کی، حالانکہ دل میں اُنھیں پورا یقین تھا کہ اچھی رقم ملے گی اور میں نے بھی طے کر لیا تھا کہ اپنے مقدور بھر کوئی بات اٹھا نہ رکھوں گی، شادی کی خیر و عافیت انجام پانے میں کوئی شبہ نہ تھا لیکن ان مہاشے کے آگے میری ایک نہ چلتی تھی یہ رسم بیہودہ ہے یہ رسم بے معنی ہے۔ یہاں روپے کی کیا ضرورت یہاں گیتوں کی کیا ضرورت؟ ناک میں دم تھا، یہ کیوں، وہ کیوں۔ یہ تو صاف جہیز ہے تم نے میرے میں کا لکھ لگا دی، میری آبرو مٹا دی ذرا خیال کیجیے بارات دروازے پر پڑی ہوئی ہے۔ اور یہاں بات بات پر ..... ہو رہی ہے۔ شادی کی ساعت رات کے بارہ بجے تھے، اس دن لڑکی کے ماں باپ برت رکھتے ہیں میں نے بھی برت رکھا۔ لیکن آپ کو ضد تھی کہ برت کی کوئی ضرورت نہیں۔ جب لڑکے کے والدین برت نہیں رکھتے تو لڑکی کے والدین کیوں رکھیں اور سارا خاندان ہر چند منع کرتا رہا لیکن آپ نے حسب معمول ناشتہ کیا، کھانا کھایا، خیر رات کو شادی کے وقت کنیادان کی رسم آئی آپ کو کنیادان کی رسم پر ہمیشہ سے اعتراض ہے اسے آپ مہمل سمجھتے ہیں لڑکی دان کی چیز نہیں۔ دان روپے کا ہوتا ہے، جانور بھی دان دیئے جا سکتے ہیں لیکن لڑکی کا دان ایک لچری بات ہے، کتنا سمجھاتی ہوں "صاحب پرانا رواج ہے شاستروں میں صاف اس کو حکم ہے"۔

عزیز و اقارب سمجھا رہے ہیں۔ مگر آپ ہیں کہ کان پر جوں نہیں رینگتی کہتی ہوں دنیا کیا کہے گی ؟ یہ لوگ کیا بالکل لامذہب ہو گئے مگر آپ کان ہی نہیں دیتے۔ پیروں پڑی یہاں تک کہا کہ بابا تم کچھ نہ کرنا، جو کچھ کرنا ہو گا میں کر لوں گی تم صرف چل کر منڈپ میں لڑکے کے پاس بیٹھ جاؤ اور اُسے دعا دو مگر اس مرد خدا نے مطلق سماعت نہ کی۔ آخر مجھے رونا آ گیا، باپ کے ہوتے میری لڑکی کا کنیا دان چچا یا ماموں کرے یہ مجھے منظور نہ تھا، میں نے تنہا کنیا دان کی رسم ادا کی آپ گھر جھانکے تک نہیں اور لطف یہ کہ آپ ہی مجھ سے روٹھ بھی گئے بارات کی رخصتی کے بعد مجھ سے مہینوں بولے نہیں جھک مار کر مجھ ہی کو منانا پڑا۔

مگر کچھ عجیب دل لگی ہے کہ ان ساری برائیوں کے باوجود میں ان سے ایک دن کے لیے بھی جدا نہیں رہ سکتی۔ ان سارے عیوب کے باوجود میں اُنھیں پیار کرتی ہوں ان میں وہ کون سی خوبی ہے جس پر میں فریفتہ ہوں مجھے خود نہیں معلوم مگر کوئی چیز ہے ضرور جو مجھے ان کا غلام بنائے ہوئے ہے، وہ ذرا معمول سے دیر میں گھر آتے ہیں تو میں بے صبر ہو جاتی ہوں، ان کا سر درد کرے تو میری جان نکل جاتی ہے۔ آج اگر تقدیر ان کے عوض مجھے کوئی علم اور عقل کا پتلا حسن اور دولت کا دیوتا بھی دے تو میں اُس کی طرف آنکھ اُٹھا کر نہ دیکھوں یہ فرض کی بیڑی نہیں ہے ہرگز نہیں۔ یہ رواجی وفاداری بھی نہیں ہے بلکہ ہم دونوں کی فطرتوں میں کچھ ایسی رواداریاں کچھ ایسی صلاحیتیں پیدا ہو گئی ہیں گویا کسی مشین کے کُل پُرزے گھس گھسا کر فٹ ہو گئے ہوں۔ اور ایک پُرزے کی جگہ دوسرا پُرزہ کام نہ دے سکے چاہے وہ پہلے سے کتنا ہی سڈول نیا اور خوشنما کیوں نہ ہو، جاتے ہوئے

رستہ سے ہم بے خوف، آنکھیں بند کیے چلے جاتے ہیں۔ اس کے نشیب و فراز موڑ اور گھماؤ اب ہماری آنکھوں میں سمائے ہوئے ہیں۔ اس کے برعکس کسی انجان رستے پر چلنا کتنی زحمت کا باعث ہو سکتا ہے، قدم قدم پر گمراہ ہو جانے کے اندیشے ہر لمحہ چور اور رہزن کا خوف! بلکہ شاید آج میں اُن کی برائیوں کو خوبیوں سے تبدیل کرنے پر بھی تیار نہیں۔

کفن

جھونپڑے کے دروازے پر باپ اور بیٹا دونوں ایک بجھے ہوئے الاؤ کے سامنے خاموش بیٹھے ہوئے تھے اور اندر بیٹے کی نوجوان بیوی بدھیا دردِ زہ سے پچھاڑیں کھا رہی تھی اور رہ رہ کر اس کے منہ سے ایسی دل فراش صدا نکلتی تھی کہ دونوں کلیجہ تھام لیتے تھے۔ جاڑوں کی رات تھی فضا سناٹے میں غرق، سارا گاؤں تاریکی میں جذب ہو گیا تھا۔

گھیسو نے کہا "معلوم ہوتا ہے بچے گی نہیں۔ سارا دن تڑپتے ہو گیا۔ جا دیکھو تو آ"

مادھو دردناک لہجے میں بولا "مرنا ہے تو جلدی مر کیوں نہیں جاتی۔ دیکھ کر کیا آؤں؟"

"تو بڑا بے درد ہے بے! سال بھر جس کے ساتھ جندگانی کو دکھ ہو گا۔ اس کے ساتھ اتنی بے وفائی؟"

چماروں کا کنبہ تھا اور سارے گاؤں میں بدنام گھیسو ایک دن کام کرتا تو تین

دن آرام۔ مادھو اتنا کام چور تھا کہ گھنٹہ بھر چلم پیتا۔ اس لیے انہیں کوئی رکھتا ہی نہ تھا۔ گھر میں مٹھی بھر اناج موجود ہو تو ان کے لیے کام کرنے کی قسم تھی جب ایک دو فاقے ہو جاتے تو گھیسو درختوں پر چڑھ کر لکڑیاں توڑ لاتا اور مادھو بازار میں بیچ آتا اور جب تک وہ پیسے رہتے دونوں اِدھر اُدھر مارے مارے پھرتے۔ جب فاقے کی نوبت آجاتی تو پھر لکڑیاں توڑتے یا کوئی مزدوری تلاش کرتے۔ گاؤں میں کام کی کمی نہ تھی۔ کاشتکاروں کا گاؤں تھا۔ محنتی آدمی کے لیے پچاس کام تھے۔ مگر ان دونوں کو اسی وقت بلاتے جب دو آدمیوں سے ایک کا کام پاکر بھی قناعت کر لینے کے سوا اور کوئی چارہ نہ ہوتا۔ کاش دونوں سادھو ہوتے تو انہیں قناعت اور توکل کے لیے ضبطِ نفس کی مطلق ضرورت نہ ہوتی۔ یہ ان کی خلقی صفت تھی۔ عجب زندگی تھی ان کی گھر میں مٹی کے دو چار برتنوں کے سوا کوئی اثاثہ نہیں تھا۔ پھٹے چیتھڑوں سے اپنی عریانی کو ڈھانکے ہوئے۔ دنیا کے مکروں سے آزاد۔ قرض سے لدے ہوئے گالیاں بھی کھاتے تھے۔ مگر کوئی غم نہیں۔ مسکین اتنے کہ وصولی کی مطلق امید نہ ہونے پر بھی لوگ انہیں کچھ نہ کچھ قرض دے دیتے تھے۔ مٹر یا آلو کی فصل میں کھیتوں سے مٹر یا آلو اکھاڑ لاتے اور بھون بھون کر کھاتے۔ یا دس پانچ اوکھ توڑ لاتے اور رالوں کو چوستے۔ گھیسو نے اسی زاہدانہ انداز سے ساٹھ سال کی عمر کاٹ دی اور مادھو بھی سعادت مند بیٹے کی طرح باپ کے نقشِ قدم پر چل رہا تھا بلکہ اس کا نام اور بھی روشن کر رہا تھا۔ اس وقت بھی دونوں آلاؤ کے سامنے بیٹھے آلو بھون رہے تھے۔ جو کسی کے کھیت سے کھود لائے تھے۔ گھیسو کی بیوی کا تو مدت ہوئی انتقال ہو چکا تھا۔ مادھو کی شادی پچھلے سال ہوئی تھی۔ جب سے یہ

عورت آئی تھی ۔ اس نے خاندان میں تمدن کی بنیاد ڈالی تھی، پسائی کرکے، گھاس چھیل کر وہ سیر بھر آٹے کا انتظام بھی کر لیتی تھی ۔ اور ان دونوں بے غیرتوں کا دوزخ بھرتی رہتی تھی ۔ جب سے وہ آئی یہ دونوں اور بھی آرام طلب اور السی ہو گئے تھے ۔ بلکہ کچھ اکڑنے بھی لگے تھے ۔ کوئی کام کرنے کو بلاتا تو بے نیازی کی شان سے دوگنی مزدوری مانگتے ۔ وہی عورت آج صبح دردِ زہ سے مر رہی تھی اور یہ دونوں شاید اسی انتظار میں تھے کہ یہ مر جائے تو آرام سے سوئیں ۔

گھیسو نے آلو نکال کر چھیلتے ہوئے کہا "جا کر دیکھ تو کیا حالت ہے اس کی ۔ چڑیل کا پھساد ہو گا اور کیا ۔ یہاں تو اوجھا بھی ایک روپیہ مانگتا ہے ۔ کس کے گھر سے آئے ؟"

مادھو کو اندیشہ تھا کہ وہ کوٹھری میں گیا تو گھیسو آلوؤں کا بڑا حصہ صاف کر دے گا بولا "مجھے وہاں ڈر لگتا ہے ۔"

"ڈر کس بات کا ہے ؟ میں تو یہاں ہوں ہی ۔"

"میری عورت مری تھی تو میں تین دن اس کے پاس سے ہلا بھی نہیں اور پھر مجھ سے لجائے گی کہ نہیں ۔ کبھی اس کا منہ نہیں دیکھا ۔ آج اس کا اگھرا ہوا بدن دیکھوں ۔ اُسے تن کی سُدھ بھی تو نہ ہو گی ۔ مجھے دیکھ لے گی تو کھل کر ہاتھ پاؤں بھی نہ پٹک سکے گی ۔"

"میں سوچتا ہوں کہ کوئی بال بچہ ہو گیا تو کیا ہو گا ۔ سونٹھ، گڑ، تیل کچھ بھی تو نہیں ہے گھر میں ۔"

"سب کچھ آجائے گا۔ بھگوان بچہ دیں تو ، جو لوگ ابھی ایک پیسہ نہیں دے رہے ہیں وہی تب بلا کر دیں گے ۔ میرے تو لڑکے ہوئے ۔ گھر میں کبھی کچھ نہ تھا ، مگر اسی طرح ہر بار کام چل گیا "

جس سماج میں رات دن کام کرنے والوں کی حالت ان کی حالت سے کچھ بہت اچھی نہ تھی ۔ اور کسانوں کے مقابلے میں وہ لوگ جو کسانوں کی کمزوری سے فائدہ اٹھانا جانتے تھے کہیں زیادہ فارغ البال تھے ۔ وہاں اس قسم کی ذہنیت کا پیدا ہو جانا کوئی تعجب کی بات نہ تھی ۔ ہم تو کہیں گے گھیسو کسانوں کے مقابلے میں زیادہ باریک بیں تھا ۔ اور کسانوں کی تہی دماغ جمعیت میں شامل ہونے کے بدلے شاطروں کی فتنہ پرداز جماعت میں شامل ہو گیا تھا ۔ ہاں اس میں یہ صلاحیت نہ تھی کہ شاطروں کے آئین و آداب کی پابندی بھی کرتا ۔ اس لیے جہاں اس کی جماعت کے اور لوگ گاؤں کے سرغنہ اور مکھیا بنے ہوئے تھے ۔ اس پر سارا گاؤں انگشت نمائی کرتا تھا ۔ پھر بھی اسے یہ تسکین تو تھی ہی کہ اگر وہ خستہ حال ہے تو کم از کم اسے کسانوں کی سی جگر توڑ محنت تو نہیں کرنی پڑتی اور اس کی سادگی اور بے زبانی سے دوسرے بے جا فائدہ تو نہیں اٹھاتے ۔

دونوں آلو نکال نکال کر جلتے جلتے کھانے لگے ۔ کل سے کچھ نہیں کھایا تھا ۔ اتنا صبر نہ تھا کہ انہیں ٹھنڈا ہو جانے دیں ۔ کئی بار دونوں کی زبانیں جل گئیں چھل جانے پر آلو کا بیرونی حصہ تو بہت زیادہ گرم نہ معلوم ہوتا لیکن دانتوں کے تلے پڑتے ہی اندر کا حصہ زبان اور حلق اور تالو کو جلا دیتا تھا اور اس انگارے کو منہ میں رکھنے سے زیادہ خیریت اس میں تھی کہ وہ اندر پہنچ جائے وہاں اسے

ٹھنڈا کرنے کے لیے کافی سامان تھا۔ اس لیے دونوں جلد جلد نگل جاتے۔ حالانکہ اس کوشش میں ان آنکھوں سے آنسو نکل آئے۔

گھیسو کو اس وقت ٹھاکر کی برات یاد آئی جس میں بیس سال پہلے وہ گیا تھا اس دعوت میں اسے جو سیری نصیب ہوئی تھی وہ اس کی زندگی میں ایک یادگار واقعہ تھی اور آج بھی اس کی یاد تازہ تھی۔ بولا "وہ بھوج نہیں بھولتا، جب سے پھر اس طرح کا کھانا اور پھر پیٹ بھر نہیں ملا۔ لڑکی والوں نے سب کو پوڑیاں کھلائی تھیں، سب کو، چھوٹے بڑے سب نے پوڑیاں کھائیں اور اصلی گھی کی چٹنی رائتہ تین طرح کے سوکھے ساگ ایک رس دار ترکاری، دھی چٹنی، مٹھائی۔ اب کیا بتاؤں کہ اس بھوج میں کتنا سواد ملا۔ کوئی روک نہیں تھی۔ جو چیز مانگو اور جتنا چاہو کھاؤ۔ لوگوں نے تو ایسا کھایا کہ کسی سے پانی نہ پیا گیا، مگر پروسنے والے ہیں کہ گرم گرم گول گول مہکتی کچوڑیاں ڈالے دیتے ہیں، منع کرتے ہیں کہ نہیں چاہیے۔ پتل کو ہاتھ سے روکے ہوئے ہیں مگر وہ ہیں کہ دیئے جاتے ہیں اور جب سب نے منہ دھو لیا تو ایک ایک بیڑا پان بھی ملا۔ مگر مجھے پان لینے کی کہاں سدھ تھی۔ کھڑا نہ ہوا جاتا تھا۔ چٹ پٹ گھر جا کر اپنے کمبل میں لیٹ گیا۔ ایسا دریا دل تھا وہ ٹھاکر"۔

مادھو نے ان تکلفات کا مزہ لیتے ہوئے کہا۔ "اب ہمیں کوئی ایسا بھوج کھلاتا"۔

"اب کوئی کیا کھلائے گا۔ وہ جمانا دوسرا تھا۔ اب تو سب کو کپھایت سوجھتی ہے۔ شادی بیاہ میں مت کھرچ کرو۔ کریا کرم میں مت کھرچ کرو۔ پوچھو

گریبوں کا مال بٹور بٹور کر کہاں رکھو گے؟ مگر بٹورنے میں تو کمی نہیں ہے۔ ہاں کھرچ میں کپھایت سوجھتی ہے۔"

"تم نے ایک بیس پوڑیاں کھائی ہوں گی۔"

"بیس سے جیادہ کھائی تھیں۔"

"میں پچاس کھا جاتا۔"

"پچاس سے کم میں نے بھی نہ کھائی ہوں گی۔ اچھا پٹھا تھا۔ تو اس کا آدھا بھی نہیں ہے۔"

آلو کھا کر دونوں نے پانی پیا اور وہیں الاؤ کے سامنے اپنی دھوتیاں اوڑھ کر پاؤں پیٹ میں ڈالے سو رہے۔ جیسے دو بڑے اژدھے کنڈلیاں مارے پڑے ہیں۔ اور بدھیا ابھی تک کراہ رہی تھی۔

(۲)

صبح کو مادھو نے کوٹھری میں جا کر دیکھا تو اس کی بیوی ٹھنڈی ہو گئی تھی۔ اس کے منہ پر مکھیاں بھنک رہی تھیں۔ پتھرائی ہوئی آنکھیں اوپر ٹکی ہوئی تھیں۔ سارا جسم خاک میں لت پت ہو رہا تھا۔ اس کے پیٹ میں بچہ مر گیا تھا۔

مادھو بھاگا ہوا گھیسو کے پاس آیا۔ پھر دونوں زور زور سے ہائے ہائے کرنے اور چھاتی پیٹنے لگے۔ پڑوس والوں نے یہ آہ و زاری سنی تو دوڑے ہوئے آئے۔ اور رسم قدیم کے مطابق غم زدوں کی تشفی کرنے لگے۔

مگر زیادہ رونے دھونے کا موقع نہ تھا۔ کفن کی اور لکڑی کی فکر کرنی تھی۔ گھر میں تو پیسہ اس طرح غائب تھا جیسے چیل کے گھونسلے سے ماس۔

باپ بیٹے روتے ہوئے گاؤں کے زمیندار کے پاس گئے۔ وہ ان دونوں کی صورت سے نفرت کرتے تھے۔ کئی بار انہیں اپنے ہاتھوں پیٹ چکے تھے۔ چوری کی علت میں، وعدہ پر کام نہ آنے کی علت میں۔ پوچھا "کیا ہے بے گھیسوا روتا کیوں ہے؟ اب تو تیری صورت ہی نظر نہیں آتی۔ اب معلوم ہوتا ہے کہ تم اس گاؤں میں رہنا نہیں چاہتے۔"

گھیسوا نے زمین پر سر رکھ کر آنکھوں میں آنسو بھرتے ہوئے کہا "سرکار بڑی بپت میں ہوں۔ مادھو کی گھر والی رات گجر گئی۔ دن بھر تڑپتی رہی۔ سرکار آدھی رات تک ہم دونوں اس کے سرہانے بیٹھے رہے۔ دوا دارو جو کچھ ہو سکا، سب کیا، مگر وہ ہمیں دگا دے گئی۔ اب کوئی ایک روٹی دینے والا نہیں رہا۔ مالک تباہ ہو گئے۔ گھر اجڑ گیا۔ آپ کا گلام ہوں۔ اب آپ کے سوا اس کی مٹی کون پار لگائے گا۔ ہمارے ہاتھ میں تو جو کچھ وہ سب دوا دارو میں اٹھ گیا سرکار ہی کی دیا ہو گی تو اس کی مٹی اٹھے گی۔ آپ کے سوا اور کس کے دروازہ پر جاؤں۔"

زمیندار صاحب رحم دل آدمی تھے، مگر گھیسو پر رحم کرنا کالے کمبلوں پر رنگ چڑھانا تھا۔ جی میں تو آیا کہہ دیں "چل دور ہو یہاں سے۔ لاش گھر میں رکھ سڑا۔ یوں تو بلانے سے بھی نہیں آتا، آج جب غرض پڑی تو آکر خوشامد کر رہا ہے حرام خور کہیں کا! بدمعاش!" مگر یہ غصہ یا انتقام کا موقعہ نہیں تھا۔ طوعاً و کرہاً دو روپے نکال کر پھینک دیئے، مگر تشفی کا ایک کلمہ بھی منہ سے نہ نکالا۔ اس کی طرف تاکا تک نہیں۔ گویا سر کا بوجھ اتارا ہو۔

جب زمیندار صاحب نے دو روپے دئے تو گاؤں کے بنیے، مہاجنوں کو انکار کی جرأت کیوں کر ہوتی۔ گھیسو زمیندار کے نام کا ڈھنڈورا پیٹتا جاتا تھا۔ کسی نے دو آنے دیے، کسی نے چار آنے، ایک گھنٹے میں گھیسو کے پاس پانچ روپے کی معقول رقم جمع ہوگئی۔ کسی نے غلہ دے دیا اور کسی نے لکڑی اور دوپہر کو گھیسو اور مادھو بازار سے کفن لانے چلے۔ ادھر لوگ بانس وانس کاٹنے لگے۔ گاؤں کی رقیق القلب عورتیں لاش کو آ آ کر دیکھتی تھیں اور اس کی بے بسی پر دو بوند آنسو گرا کر چلی جاتی تھیں۔

(۳)

بازار میں پہنچ کر گھیسو بولا "لکڑی تو اسے جلانے بھر کو مل گئی ہے۔ کیوں مادھو؟"

مادھو بولا۔ "ہاں لکڑی تو بہت ہے۔ اب کچھن چاہیے"

"تو کوئی ہلکا سا کچھن لے لیں"

"ہاں اور کیا۔ لاش اٹھتے اٹھتے رات ہو جائے گی۔ رات کو کچھن کون دیکھتا ہے"

"کیا برا رواج ہے کہ جسے جیتے جی تن ڈھانکنے کو چیتھڑا بھی نہ ملے اسے مرنے پر نیا کچھن چاہیے"

"کچھن لاش کے ساتھ جل ہی تو جاتا ہے"

"اور کیا رکھا ہے۔ یہی پانچ روپے ملتے تو کچھ دوا دارو کرتے"

دونوں ایک دوسرے کے دل کا ماجرا مخفی طور پر سمجھ رہے تھے۔ بازار میں

اِدھر اُدھر گھومتے رہے۔ یہاں تک کہ شام ہوگئی۔ دونوں اتفاق سے عمداً ایک شراب خانے کے سامنے آپہنچے اور گویا کسی طے شدہ فیصلے کے مطابق اندر گئے۔ وہاں ذرا دیر تک دونوں تذبذب کی حالت میں کھڑے رہے۔ پھر گھیسو نے ایک بوتل شراب لی، کچھ گزک اور دونوں برآمدے میں بیٹھ کر پینے لگے۔

کئی کجیاں پیہم پینے کے بعد دونوں سرور میں آگئے۔

گھیسو بولا۔ "کفن لگانے سے کیا ملتا ہے؟ آخر جل ہی تو جاتا۔ کچھ بہو کے ساتھ تو نہ جاتا۔"

مادھو آسمان کی طرف دیکھ کر بولا، گویا فرشتوں کو اپنی معصومیت کا یقین دلا رہا ہو "دنیا کا دستور ہے۔ لوگ بامنوں کو ہجاروں روپے کیوں دیتے ہیں؟ کون دیکھتا ہے پرلوک میں ملتا ہے یا نہیں۔"

"بڑے آدمیوں کے پاس دھن ہے پھونکیں، ہمارے پاس پھونکنے کو کیا ہے"۔

"لیکن لوگوں کو جواب کیا دوگے؟ لوگ پوچھیں گے نہیں کپھن کہاں ہے"

گھیسو ہنسا "کہہ دیں گے روپے کمر سے کھسک گئے۔ بہت ڈھونڈا ملے نہیں"

مادھو بھی ہنسا۔ اس غیر متوقع خوش نصیبی پر قدرت کو اس طرح شکست دینے پر بولا۔ "بڑی اچھی تھی بیچاری۔ مری بھی تو خوب کھلا پلا کر"۔

آدھی بوتل سے زیادہ ختم ہوگئی۔ گھیسو نے دو سیر پوڑیاں منگوائیں۔ گوشت اور سالن اور چٹ پٹی کلیجیاں اور تلی ہوئی مچھلیاں، شراب خانے کے سامنے ہی دوکان تھی۔ مادھو لپک کر دو پتلوں میں ساری چیزیں لے آیا۔ پورے ڈیڑھ روپے خرچ ہوگئے۔ صرف تھوڑے سے پیسے بچ رہے۔

دونوں اس وقت اس شان سے بیٹھے ہوئے پوڑیاں کھا رہے تھے جیسے جنگل میں کوئی شیر اپنا شکار اڑا رہا ہو۔ نہ جواب دہی کا خوف تھا نہ بدنامی کی فکر۔ ضعف کے ان مراحل کو انھوں نے بہت پہلے طے کر لیا تھا۔ گھیسو فلسفیانہ انداز سے بولا "ہماری آتما پرسن ہو رہی ہے۔ تو کیا اسے پن نہ ہوگا۔"

مادھو نے فرط عقیدت جھکا کر تصدیق کی۔ "جردر سے جردر ہوگا۔ بھگوان تم انتر جامی (علیم) ہو۔ اسے بیکنٹھ لے جانا۔ ہم دونوں ہردے سے اسے دعا دے رہے ہیں۔ آج جو بھوجن ملا وہ کبھی عمر بھر نہ ملا تھا۔"

ایک لمحے کے بعد مادھو کے دماغ میں ایک تشویش پیدا ہوئی۔ "کیوں دادا ہم لوگ بھی تو ایک نہ ایک دن وہاں جائیں گے۔"

گھیسو نے اس طفلانہ سوال کا کوئی جواب نہ دیا۔ مادھو کی طرف پر ملامت انداز سے دیکھا۔

"جو وہاں ہم لوگوں سے وہ پوچھے گی کہ تم نے ہمیں کپھن کیوں نہیں دیا تو کیا کہو گے؟"

"کہیں گے تمھارا سر"

"پوچھے گی تو ضرور۔"

"تو کیسے جانتا ہے اسے کپھن نہ ملے گا۔ تو مجھے ایسا گدھا سمجھتا ہے۔ میں ساٹھ سال دنیا میں کیا گھاس کھودتا رہا ہوں۔ اس کو کپھن ملے گا اور اس سے بہت اچھا ملے گا جو ہم دیتے۔"

مادھو کو یقین نہ آیا۔ بولا "کون دے گا؟ روپے تو تم نے چٹ کر دئے۔"

گھیسو تیز ہو گیا۔ "میں کہتا ہوں اسے کچھ ملے گا۔ تو مانتا نہیں"۔

"کون دے گا؟ بتاتے کیوں نہیں"۔

"وہی لوگ دیں گے جنہوں نے اب کے دیا۔ ہاں وہ روپے ہمارے ہاتھ نہ آئیں گے اور اگر کسی طرح آجائیں تو پھر ہم اسی طرح یہاں بیٹھے پئیں گے اور کچھ تیسری بار ملے گا"۔

جوں جوں اندھیرا بڑھتا تھا اور ستاروں کی چمک تیز ہوتی تھی۔ مے خانے کی رونق بھی بڑھتی جاتی تھی۔ کوئی گاتا، کوئی لہکتا تھا کوئی اپنے رفیق کے گلے لپٹا جاتا تھا۔ کوئی اپنے دوست کے منہ میں ساغر لگائے دیتا تھا۔ وہاں کی فضا میں سرور تھا۔ ہوا میں نشہ۔ کتنے تو چلو میں الو ہو جاتے ہیں۔ یہاں آتے تھے صرف خود فراموش کا مزہ لینے کے لیے۔ شراب سے زیادہ یہاں کی ہوا سے مسرور ہوتے تھے۔ زیست کی بلا یہاں کھینچ لاتی تھی۔ اور کچھ دیر کے لیے وہ بھول جاتے تھے کہ وہ زندہ ہیں یا مردہ ہیں یا زندہ درگور ہیں۔

اور یہ دونوں باپ بیٹے اب بھی مزے لے لے کر چسکیاں لے رہے تھے۔ سب کی نگاہیں ان کی طرف جمی تھیں۔ کتنے خوش نصیب ہیں دونوں۔ پوری بوتل بیچ میں ہے۔

کھانے سے فارغ ہو کر مادھو نے بچی ہوئی پوڑیوں کا پتل اٹھا کر ایک بھکاری کو دے دیا کھڑا ان کی طرف گرسنہ نگاہوں سے دیکھ رہا تھا اور "پینے" کے غرور، ولولہ اور مسرت کا اپنی زندگی میں پہلی بار احساس کیا۔

گھیسو نے کہا۔ "لے جا۔ کھوب کھا اور اسیر باد دے۔ جس کی کمائی ہے

وہ مر گئی، مگر تیرا اسیر باد اسے جرور پہنچ جائے گا۔ روئیں روئیں سے اسیر باد دے بڑی گاڑھی کمائی کے پیسے ہیں۔"

مادھو نے پھر آسمان کی طرف دیکھ کر کہا" بینکھٹ میں جائے۔ دادا بینکھٹ کی رانی بنے گی۔"

گھیسو کھڑا ہو گیا اور جیسے مسرت کی لہروں میں تیرتا ہوا بولا۔"ہاں بیٹا بینکھٹ میں جائے گی۔ کسی کو ستایا نہیں، کسی کو دبایا نہیں، مرتے وقت ہماری جندگی کی سب سے بڑی لاسا پوری کر گئی۔ وہ نہ بینکھٹ میں جائے گی تو کیا یہ موٹے موٹے لوگ جائیں گے جو گریبوں کو دونوں ہاتھ سے لوٹتے ہیں اور اپنے باپ کو دھونے کے لیے گنگا میں نہاتے ہیں اور مندر میں جل چڑھاتے ہیں۔"

یہ خوش اعتقادی کا رنگ بھی بدلا۔ تلون نشہ کی خاصیت ہے۔ یاس اور غم کا دور ہوا۔ مادھو بولا،" مادھو بولا،"مگر دادا بیچاری نے جندگی میں بڑا دکھ بھوگا۔ مری تو بھی کتنا دکھ جھیل کر" (دونوں ہاتھ آنکھوں پر رکھ کر رونے لگا)

گھیسو نے سمجھایا۔"کیوں روتا ہے بیٹا۔ کھس ہو کہ وہ مایا جال سے مکٹ ہو گئی۔ جنجال سے چھوٹ گئی۔ بڑی بھاگوان تھی جو اتنی جلدی مایا موہ کے بندھن توڑ دیئے۔"

اور دونوں وہیں کھڑے ہو کر گانے لگے۔

ٹھگن کیوں نینا جمکا دے ٹھگنی

سارا مے خانہ محو تماشہ تھا اور یہ دونوں میکش محویت کے عالم میں گائے جاتے تھے۔ پھر دونوں ناچنے لگے۔ اچھلے بھی، کودے بھی، گرے بھی، مٹکے بھی۔ بھاؤ بھی بتائے اور آخر نشہ سے بدمست ہو کر وہیں گر پڑے۔"

برقی کتب کی دنیا میں خوش آمدید

آپ ہمارے کتابی سلسلے کا حصہ بن سکتے ہیں

مزید اس طرح کی شان دار، مفید اور نایاب کتب

کے حصول کے لیے ہمارے واٹس ایپ گروپ کو

جوائن کریں

ایڈمن پینل :

محمد ثاقب ریاض: 03447227224

سدرہ طاہر: 03340120123

حسنین سیالوی: 03056406067

Imagitor

منشی پریم چند چھوٹے چھوٹے قصے لکھنے میں ید طولیٰ رکھتے ہیں اور حق یہ ہے کہ آپ کے اس قسم کے افسانے کس زمانے کے نام نہاد قصوں کے ساتھ وہی نسبت رکھتے ہیں جو سچے نگینوں کو جھوٹے پتھروں کے ساتھ ہوتی ہے

● ——— رام بابو سکسینہ

وہ افسانے میں پہلی بار ہمیں اس بات کا احساس دلاتا ہے کہ حقیقتاً کہانی میں دلکشی دلچسپی مقصد زبان کی لطافت اور پلاٹ کی تعمیر ساری کی ساری چیزیں کیسے ایک جگہ ہو سکتی ہیں

● ——— احتشام حسین

اردو افسانے کے اس ابتدائی دور میں حقیقت پسندی کے رجحان کا اہم ترین علمبردار پریم چند ہے۔ پریم چند زمین کی سوندھی سوندھی باس سے بہت قریب تھا اس نے تخیل کی رفعتوں کی بجائے زندگی کے ارضی پہلوؤں اور سماج کی واضح کروٹوں کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا۔ اسی لئے پریم چند کے ہاں پہلی بار کردار کے نقوش پوری طرح ابھرے ہوئے نظر آتے ہیں۔

● ——— ڈاکٹر وزیر آغا

پریم چند اردو کے بڑے افسانہ نگار ہیں۔ انھوں نے کئی اچھے ناول لکھے ہیں مگر اس میں شک نہیں کہ دراصل وہ افسانہ نگار ہیں۔ پریم چند کا میدان اتنا ہی وسیع ہے جتنی کائنات ——— آل احمد سرور

منشی پریم چند کی تصانیف

- زادِ راہ (افسانے)
- میدانِ عمل (ناول)
- پریم چند کے بہترین افسانے

(ناشر)

مکتبہ میری لائبریری ——— لاہور ۲